25

4.60

Text

TEXT

Acc: No
24323
19-1-59
SIR SYED BOOK DEPOT
سر سید بک ڈپو
علی گڈھ
ALIGARH
ALLAMA IQBAL LIBRARY
24323

مقدمہ

آبِ حیات

زبانِ اُردو کی مکمل تاریخ

اور اس کی عہد بعہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کا مفصّل بیان

از

حضرت شمس العلما مولینا محمد حسین صاحب آزادؒ

حسبِ فرمائش

آغا محمد طاہر نبیرۂ حضرتِ آزاد

مالک آزاد بکڈپو کوچۂ چیلان دہلی

ہوالعلیم

مقدمۂ آبِ حیات

یعنی

زبان اُردو کی مکمل تاریخ

اور

عہد بعہد کی تبدیلیوں اور ترقیوں کا مفصل بیان

مصنفہ

حضرت شمس العلماء پروفیسر مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد

برائے آزاد بکڈپو کوچہ چیلان دہلی

مطبوعہ جمال پریس جامع مسجد دہلی

قیمت ۔عہ،

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No.........
Date.........
SRINAGAR
CHECKED
UL09
278
ST 0
17

سر سید بک ڈپو
علی گڈھ
ED BOOK DEPOT
ALIGARH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ازآد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اُردو ہے۔ بزرگوں سے لے کر آج تک زبانوں کی تحقیقات میں کمال سرگرمی اور جستجو رہی۔ اب چند سال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی زبان ترقی کے قدم برابر آگے بڑھا رہی ہے۔ یہانتک کہ علمی زبانوں کے عمل میں دخل پیدا کرلیا اور عنقریب بارگاہ علم میں کسی درجۂ خاص کی کرسی پر جلوس کیا چاہتی ہے۔ ایک دن اسی خیال میں تھا اور دیکھ رہا تھا کہ کس طرح اس نے ظہور پکڑا کس طرح قدم بقدم آگے بڑھی۔ کس طرح عہد بعہد اس درجہ تک پہنچی۔ تعجب ہوا کہ ایک بچہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ملے۔ شعرا اسے اٹھالیں۔ اور ملکِ سخن میں پال کر پرورش کریں۔ انجام کو یہانتک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف وتالیف پر قابض ہوجائے۔

اس حالت میں اسکے عہد بعہد کی تبدیلیاں، اور ہر عہد میں اس کے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں جن کی وقت بوقت کی تربیت اور اصلاح نے اس بچے کو انگلی پکڑ کے قدم بقدم آگے بڑھایا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچایا کہ جو آج حاصل ہے۔ صاف نظر آیا کہ ہر عہد میں وہ جُدا جُدا رنگ بدل رہا ہے اور اُس کے باکمال آیت ترز کرنے والے وقت بوقت ترکیب اور الفاظ سے اس کے رفتار و اطوار میں اصلاحیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے کہ مسلسل اور متواتر قایم ہوئے اور برخاست ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو رخصت کیا۔ اور اپنا رنگ

نیا جمایا۔ یہاںتک کہ پانچویں جلسے کا بھی دَور آیا جو کہ اب پیشِ نظر موجود ہے۔ ہر ایک
جلسہ میں صدر نشین اور ارکان انجمن نظر آئے کہ جن میں عہد بعہد کے بزرگوں
کی رفتار و گفتار وضع لباس جدا جدا ہے۔ مگر اصلاح کے قلم سے کسی کا ہاتھ
خالی نہیں۔ اور اس کام کو ہر ایک اپنا فرض سمجھے ہوئے ہے۔ باوجود اس کے
اہلِ مجلس بھی شوق کے دامن پھیلائے ہیں۔ اور قبول کے ہاتھ سینوں پر رکھے
ہیں۔ زبان مذکور کی ہر جلسہ میں نئی صورت نظر آئی کبھی بچہ۔ کبھی لڑکا کبھی نوجوان
مگر یہ معلوم ہوا کہ دیکھتا ہے تو انھیں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور بولتا ہے
تو انھیں کی زبان سے بولتا ہے۔

غرض کہ اس زبان کے رنگ میں ان کے رفتار، گفتار اور اوضاع اطوار
بلکہ اس زمانے کے سارے چال چلن پیش نظر تھے جس میں انہوں نے زندگی
بسر کی۔ اور کیا کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی۔ ان کے جلسوں کے
ماجرے اور حریفوں کے وہ معرکے جہاں طبیعتوں نے تکلف کے پردے
اٹھا کر اپنے اصلی جوہر دکھا دئیے۔ ان کے دلوں کی آزادیاں۔ وقتوں کی مجبوریاں
مزاجوں کی شوخیاں۔ طبیعتوں کی تیزیاں۔ کہیں گرمیاں، کہیں نرمیاں۔ کچھ خوش مزاجیاں
کچھ بے دماغیاں۔ غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اس طرح عبرت کا سرمہ
دیتی تھیں، گویا وہی زمانہ اور اہلِ زمانہ موجود ہیں۔

چونکہ میں نے بلکہ میری زبان نے ایسے ہی اشخاص کی خدمتوں میں پرورش
پائی ہے اس لئے اِن خیالات میں دل کی شگفتگی کا ایک عالم تھا کہ جس کی کیفیت
کو کسی بیدار کی صنعت اور قلم کی زبان بیان نہیں کر سکتی لیکن ساتھ ہی افسوس آیا

کہ جن جوہریوں کے ذریعے سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے۔ وہ تو خاک میں مل گئے جو لوگ باقی ہیں وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ اُن کے روشن کرنے کی یا ان سے روشنی لینے کی کسی کو پروا نہیں۔ پس یہ باتیں کہ حقیقت میں اثبات اِن کے جوہر کمالات کے ہیں۔ اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چند روز میں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی اور حقیقت میں یہ حالات نہ مٹیں گے بلکہ بزرگانِ موصوف دنیا میں فقط نام کے شاعر رہجائینگے جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا۔ جو ہمارے بعد آنے والوں کے دلوں پر یقین کا اثر پیدا کر سکے۔ ہر چند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں، مگر فقط دیوان جو بکتے ہیں بغیر ان کے تفصیلی حالات کے اس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے۔ نہ اُس زمانے کا عالم اس زمانے میں دکھا سکتے۔ اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔

سوداؔ اور میرؔ وغیرہ بزرگان سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے وہ آجکل کے لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب پوچھئے تو جواب فقط یہی ہے کہ جس طرح ان کے کلاموں کو ان کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور لباس بن کر ہمارے سامنے جلوہ دے رکھا ہے۔ اِس سے اربابِ زمانہ کے دیدہ و دل بے خبر ہیں۔ اور حق پوچھو تو انہی اوصاف سے سوداؔ سوداؔ۔ اور میرؔ تقی میرؔ صاحب ہیں۔ ورنہ جسکا جی چاہے یہی تخلص رکھ لیجئے۔ خالی سوداؔ ہے تو جنون ہے۔ اور نرا میر ہے تو گنجفہ کا ایک پتا۔

میرے دوستو! زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سو رہنا۔ اور مُنہ سے بولے جانا نہیں ہے۔ زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ

نام کو شہرتِ عام ہو اور اُسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو۔ کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں۔ انھیں بقائے دوام یکساں ان ہاتھ آئیں۔ اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبار احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے اُن کے کمال مر جائیں گے۔ اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے۔

ایسے بزرگانِ باکمال کے روئیے اور رفتاروں کا دیکھنا انھیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے۔ اور ہمیں بھی دنیا کے پیچیدہ رستوں میں چلنا سکھاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کیونکر ہم بھی اپنی زندگی کو اتنا طولانی اور ایسا گراں بہا بنا سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے نہ اُس کے کلام کی خوبی۔ اور صحت و سُقم کی کیفیت کھلتی ہے۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سالِ ولادت اور سالِ فوت تک بھی نہیں کھلتا۔ اگرچہ اعتراض ان کا کچھ اصلیت سے خالی نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی معلومات زیادہ تر خاندانوں اور خاندانی باکمالوں اور اُن کی

صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ کچھ تو انقلاب زمانہ سے دل شکستہ ہو کر تصنیف سے ہاتھ کھینچ بیٹھے۔ کچھ یہ کہ علم اور اس کی تصنیفات کے انداز روز بروز کے تجربے سے رستے بدلتے ہیں۔ عربی فارسی میں اس ترقی اور اصلاح کے رستے سالہاسال سے مسدود ہو گئے۔ انگریزی زبان ترقی و اصلاح کا طلسمات ہے مگر خاندانی لوگوں نے اوّل اوّل اسکا پڑھانا اولاد کے لئے عیب سمجھا۔ اور ہماری قدیمی تصنیفوں کا ڈھنگ ایسا واقع ہوا تھا کہ وہ لوگ ایسی واردا توں کو کتابوں میں لکھنا کچھ بات نہ سمجھتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو زبانی جمع خرچ سمجھ کر دوستانہ صحبتوں کے نقل مجلس جانتے تھے اس لئے وہ ان رستوں سے اور ان کے فوائد سے آگاہ نہ ہوئے، اور یہ انھیں کیا خبر تھی کہ زمانہ کا ورق الٹ جائیگا پرانے گھرانے تباہ ہو جائیں گے۔ ان کی اولاد ایسی جاہل رہے گی کہ اسے اپنے گھر کی باتوں کی بھی خبر نہ رہے گی اور اگر کوئی بات ان حالات میں سے بیان کرے گا تو لوگ اس سے سند مانگیں گے۔ غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں۔ اور جہانتک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔ اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔ الحمدُ للہ کہ چند روز میں جسقدر پریشان خیالات تھے بہ ترتیب جمع ہو گئے۔ اسی واسطے اس مجموعہ کا نام آبِ حیات رکھا۔ اور زبان اردو کی عہد بعہد کی تبدیلی کے لحاظ سے پانچ دَور پر تقسیم کیا۔ اس طرح کہ ہر ایک دَور اپنے عہد کی زبان بلکہ اُس زمانے کی

شان دکھاتا ہے خدا کی درگاہ میں دعا ہے کہ بزرگوں کے ناموں اور کلاموں کی برکت سے مجھے اور میرے کلام کو بھی قبولِ عام اور بقائے دوام نصیب۔ آمین رب العالمین

فہرست مطالب

(۱) تاریخ زبان اُردو۔
(۲) برج بھاشا پر جب فارسی نے دخل پایا تو کیا کیا اثر کیے۔ اور آئندہ کیا اُمید ہے۔
(۳) تاریخ نظم اُردو۔
(۴) آبِ حیات کا پہلا دَور جس میں ولی اور ان کے قریب العصر باکمال جلسہ جمائے بیٹھے ہیں۔
(۵) ایضاً۔ دوسرا دَور۔ شاہ حاتم۔ خان آرزو۔ فغاں۔
(۶) تیسرا دَور۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ میر سوز۔ میر تقی۔ خواجہ میر درد۔
(۷) چوتھا دَور۔ مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت
(۸) پانچواں دَور۔ ناسخ۔ آتش۔ شاہ نصیر۔ مومن۔ ذوق۔ غالب
(۹)..... مرزا دبیر۔ میر انیس۔ خاتمہ۔

بندۂ آزاد محمد حسین
عفی اللہ عنہ

زبان اُردو کی تاریخ

اِتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اِس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اور برج کا سبزہ زار اسکا وطن ہے۔ تم خیال کروگے کہ شاید اِس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا۔ اور یہیں پھولا پھلا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ ابھی سُراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا۔ مگر باوجود اسکے مہذب قوموں میں ہمیشہ سے کھُبا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوائے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھوڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانائے فرنگ کہ ہر بات کا پتہ پتال تک نکالنے والے ہیں۔ انہوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کُل ملک پر قبضہ کر لیا۔ یہ فتحیاب غالباً جیحوں، سیحوں کے میدانوں سے اُٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ اُلٹ کر اِس ملک میں آئے ہوں گے۔ اُس زمانے کے گیت اور پُرانی پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر، ہمت کے پورے، صورت کے وجیہہ۔ رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانے

کی حیثیت بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں رہیں گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا۔ اور عجب نہیں کہ اِن کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی پردرفش کاویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لے کر چین کو نگارخانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ روما کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اندلس پہنچکر چاندی نکالی۔ یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعل بے بہا نکال لائے۔ تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور ان کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبان کہیں کچھ کچھ، اور کہیں اختلاف رکھتی ہے۔ اور یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہونگی جنکی نشانی تامل، اوریا اور تلنگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں ابتک یادگار موجود ہیں بلکہ اس حالت میں بھی ان کی شاعری اور انشاپردازی کہتی ہے کہ یہ گھلی کسی لذیذ میوے کی ہے۔ اور سنسکرت سے اسے لگاؤ تک نہیں۔

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے۔ پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے کچھ بھاگے ہوں گے وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے کچھ فتحیابوں کی

غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہونگے اور وہی شودر کہلائے ہونگے۔ چنانچہ اب تک بھی اُن کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مدت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اُسکے زمانے کی تقسیم برہما کے زمانے سے اور اس کے رسوم وقواعد سے مطابقت دکھاتی ہے۔ اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے۔ یہاں بُدھ نے اُنھیں توڑا وہاں زرتشت کے مذہب نے اُسے جلاکر خاک کیا۔ مگر ہندوؤں نے بُدھ کے بعد پھر اپنے مال کو سنبھالا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے۔

چاروں برنوں کی تقسیم اور ان کا الگ تھلگ رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا۔ مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بُری بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہوگا ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص ہوگا اور برابر اپنی قوم کا پتا بتا سکیگا۔ جو دوغلا ہوگا اُسکا سِلسلہ الگ ہوجائیگا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں تو تمام نسلیں خلط ملط ہوجاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈے نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے۔ چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کرچکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہوجائے گی۔ اسواسطے کہا کہ ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے۔ چنانچہ اُس کے قواعد اور اصول باندھے

اور ایسے جانچ کر بانٹے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا۔ اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا۔ اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گذرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے کہ اُن کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اسکا نام سنسکرت[1] رکھا جس کے معنی آراستہ پیراستہ صنعتی۔ منزہ۔ مصفّٰی۔ مقدس۔ جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اُسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اسطرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا۔ یعنی زبان الٰہی۔ زبان شاہی وید کے سنہ ترتیب جس سے اُس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ چودہ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اسوقت ان فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں اُن کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہونگی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو۔ چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی

---

[1] سن۔ مکمل۔ اور کیرت بنائے ہوئے کو کہتے ہیں سنسکرت مہذبوں کی بنائی ہوئی تھی۔ پراکرت کے معنی ہیں جو طبیعت سے نکلے پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں جو طبیعت (نیچر) نے اپنی زمین میں پیدا کر دیں۔

مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ اُن کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں دیکھا پرکت کے معنی ہیں طبیعت۔ اور جو طبیعت سے نکلے۔ چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس۔ اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے ہر بات کو خوب سمجھتے تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے۔ اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منو سمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور ویدک کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی۔ شاک منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اس لئے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی

زبان تھی۔ اِن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم۔ حکومت۔ رسم ورواج۔ دین آئین۔ سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور مگدھ دیس کی پراکرت کُل وربار اور کُل دفتروں کی زبان ہوئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم وفنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب وغریب کتابیں تصنیف ہو کر اُسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ اِن کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے۔ اور آواز بلند کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی برہمن اور کُل انسان بات کرنے کے لایق بھی نہ تھے۔ اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے۔ اس کی صرف ونحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی۔ اور رانی مُنہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً پندرہ سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا۔ اور اُس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ڈوبا ہوا ستارہ پھر اُبھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب وتاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کا سنسکرت بولنا

برہمنوں کا ستارہ چمکا

اعتبار و افتخار کی سند تھا۔ اور پراکرت عوام کی زبان تھی، کیونکہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعرا نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے۔ سبھا میں دیکھ لو۔ بادشاہ امرا۔ اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعثِ برکت تھی کہ دفعتاً زمانے کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اُسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ خدا جانے سو برس یا کئی ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے۔ اب ایرانی بہن کی داستان بھی سُن لو کہ اسپر وہاں کیا گذری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا۔ شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بودھ وغیرہ

کے حادثے گذرے اسی طرح اسپر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جاکر بسی ہوگی۔ اوّل تو مدت تک ان کے مذہب رسم ورواج اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتہ ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے جسے آج تقریباً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا۔ اور ایشیا کے امن وامان کو تہ وبالا کر دیا جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بدھ شاستر پر پڑی تھی وہی مصیبت ژند استا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی۔ وہ یونان کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ اور آتشخانے راکھ ہو کر اڑ گئے افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کئے گئے۔ اور ہزاروں کتابیں فلسفہ الٰہی اور علوم وفنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہوگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران جسے ہزاروں برس کے ملک گیری

کے نشان اسلامی اتارتے تھے۔ اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے۔ ۵۰۰ برس تک ظفر یابوں کے قبضہ میں دربار رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سنہ ۱۲۰۰ء میں پھر تنِ بے جان میں سانس آیا اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا۔ اور جہاں جہاں سے پھٹے پرانے اوراقِ پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ انہی کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد عَلَمِ اسلام کے آگے قربانی ہوئی۔ اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پُرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اُن تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ ان کے اتحادِ اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں ہے۔ وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیواناتِ بے آزار کا مارنا گناہِ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔ باد۔ ابر۔ بجلی۔ گرج۔ ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانتے تھے جس کے اظہارِ عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے۔ [illegible] الٰہی کے زمزمے

تھے جسکو وہ اپنی اصطلاح میں گاتا تھا۔ کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں یاد الہٰی کے گیت ہیں۔ فارسی مروّجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	برادر	بھراتر
پور	پُتر	دختر	دوہتر
مادر	ماتر	انگشت	انگشٹ
زانو	جانو	پا	پاد
بار	بھار	بہیم	بھینسا
بوم	بھوم	خاشاک	کرشیا
اسپ	اشو	خر	کھر

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے

اِدھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں ملکشوں کو

دخل کہاں؟ البتہ برج بھاشا نے اس بن بُلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم
دان ہندو سالہا سال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے
مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے۔ کیونکہ
اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں۔ جو کسی طرح بند نہیں
ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا۔ لین دین کرنا تھا۔ لفظوں کے
بولے بغیر گذارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے۔
اور اس کے کئی سبب ہیں۔

اوّل تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام ساتھ لاتی ہیں
(۲) اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں اُنہی کی زبان میں کہیں تو ایک
لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا
آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان
اور آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے۔ دوسرا
لفظ بولنا جائز نہیں۔

(۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے
ہیں کہ جب دو غیر زباں والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی
شدت مصروفیت میں۔ کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلدی کہہ دینے
کی غرض سے۔ کبھی آسانی سے سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ
اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گذارہ نہیں ہوتا۔
(۴) پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار اور محبت

سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے۔ جس طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

(۵) بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک ان کی بات بات کو۔ بلکہ لباس، دستار۔ رفتار، گفتار کو بھی ایسی آب وتاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لوگ اسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اس پر بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اس زمانے کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چند رکوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھی راج راسا لکھا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنے جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں یہاں کی بھاشا بھی کچھ اور بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی۔ میں نمونہ تصنیف مذکور کا دکھاتا ہوں

महाबदीन अहलयथा मुसलमान मदीन दामभीमद
लिहतनीक हैहक हनलागी बातशाह दिगान
परबरदिन हैदीवान ग्याजबली बैरमंडपावद-
कलाम अलौहजिबते अद्भुवा- बीई हज़रत
पुदायशी आस मरथं मेल सिधि वारवाह
साई देप वादर उआई. इतने मुल्क कोकारमान-
पेरन कजलीक लास के लास देसंथा रगवर
५२ पत्र पाबबाली छुधि राजबांहदीन सुलितान करसका-
सलाम लिहिबादशह। संगमौ सुलतान।

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں۔ مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے کھلتا ہے۔ مگر حرف شناس آدمی بھی اتنا جان سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی، فارسی کے اس میں موجود ہیں۔ محل۔ پروردگار۔ پیگام (پیغام) کریم۔ سرطان (یعنی سلطان) بات شاہ۔ دیوان۔ خلک (خلق) عالم۔ حجرت۔ (حضرت) ملک۔ پھرمان (فرمان) سلام۔

ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات و لوازمات کا اس ایک لفظ سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ

لکھ دیتا تو بھی جو صفات، اور اس کے لوازمات نیک یا بد، رحم یا عدل۔ زور، یا
ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے۔ وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی
طرح لفظ اسلام۔ کہ اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت، خواہ پرنام کوئی لفظ
ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سینکڑوں لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ
کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی
شخص اپنے دوست سے کہتا ہے" لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہنچینگے۔
پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آنا وہیں چل کر تماشہ
دیکھیں گے" اب خواہ صحیح خواہ بگڑے۔ مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنے سننے
والے کو سمجھا رہے ہیں۔ کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے جائیں تو بھی حقِ مطلب
بجا نہ لا سکیں گے۔ آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودھی کا زمانہ تھا
اتنا ہوا کہ اوّل کائیتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور اب کائیتھ اوّل نمبر پر
ان لفظوں کو ان کی زبانوں پہ آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے
عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی کہ اِدھر بادشاہ
اور اس کے اعلیٰ درجے کے اہل دربار نے جبہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں
کو خدا حافظ کہا۔ اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ اُدھر ہندو
شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے
بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔
اب جسقدر ممکن ہے عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں
امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل نظم اردو کی تاریخ

میں دیکھو جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

ع:۔ زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں۔ الخ

اِس سے تمھیں کچھ کچھ حال اسوقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری بھی انھیں کے مخلوقاتِ فکر سے ہے۔ باریک بیں اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ؎

بیا برادر آؤرے بھائی　　بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرّب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں لکھتے ہیں:۔

لودھ پھٹکری مُردا سنگ　　ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک

افیون چنا بھر مرچیں چار　　اُرد برابر تھوتھا ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے　　تُرت پیر نینوں کے ہرے

نظم اردو کی تاریخ میں ان کی عُمدہ پہیلیاں۔ مُکرنیاں۔ دوسخنے۔ انمل میں نے لکھدئے ہیں۔ انھیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحریں دوہروں کی ہیں۔ مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں، مگر عہد بعہد کی زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے۔ علم میں اَن پڑھ تھے۔ گرو رامانند کے چیلے ہوکر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مَت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی عربی کے لفظوں کو دیکھو:۔

دین گوایو دُنی سے دُنی نہ آئیو ہاتھ　　پیر کُہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

کبیر سر پر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہے۔ اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے اُن کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں اتنے کسی کے کلام میں نہیں۔ اور چونکہ سنہ ۱۵۰۰ء کے بعد فوت ہوئے تو اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے :-

ساس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا

نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے دیکھو۔

وارن جاؤں ان اِک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا۔ اس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ۔ فارسی، عربی کا لفظ نہیں ملتا۔ مطلب اسکا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے۔ اور ہر جگہ مل سکتی ہے۔ اس لئے نمونہ نہیں لکھتا۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت

ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی تو سلطان بہادر وہاں کا

بادشاہ تھا۔ اور بھا پانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن ودفائن وہیں رکھتا تھا۔ محاصرے کے وقت رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مل گیا اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزاین بے حساب سمیت) ہمایوں کے قبضہ میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھا تھا، اور ایک دم جدا نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے تو رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا "پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام" سب کو تعجب ہوا۔ اور ہمایوں نے کہا۔ "رومی خاں چہ کنم کہ جانور است ورنہ زبانش مے بریدم" اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کرلیں۔ غرض اس نقل سے یہ ہے کہ اسوقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ ضرور چڑھے ہوئے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمکحرام کا لفظ نکلا۔ جانور تھا۔ جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا۔

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تُلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فقیر بھی تھے۔ اُنہوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص وعام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ عربی فارسی کے موجود ہیں:۔ دوہرا رامائن:۔

سنکارے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پائے گھر ترو ترین و باگ و بڑ دیرا ویو لگا ئے
باغ

گھر بسواس بچن ہٹ بولے | کتنی بھنگ کلہ بھی کھولے
رام انیک گریب نواجے | لوک بید بر بر دیراجے
گنی گریب گرام نر نا گر | پنڈت موئے ملیں اوجاگر
مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ | تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

انہی دنوں میں سور داس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص وعام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

مایا دھام دھن دھنتا | باندھیوں ہوں اس ساج یعنی ساز
سنت سبھی جانت ہوں | تو نہ آیو باج (یعنی باز)
کھیت بہت کا ہے تم تانے | سبن سُنی آواج (یعنی آواز)
دیو نہ جانت پار اُتر آئے | چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)
لیجے پار اُتار سور کوں | مہاراج برج راج
نہیں کرت کہت پربھو تم سوں | سدگریب نواج غریب نواز

خیال کرو کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔ اخیر میں حسن خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدردانی سے ظاہر ہوئی۔ انہوں نے ایک ایک اشرفی دوہرا گوئی اور گنوان پنڈتوں کو انعام دے کر دہلی اور نواح دہلی میں شوق پھیلایا۔

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ گنی سو

برس سے اسلام آیا ہوا تھا جن کے باپ دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑتی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی اُن کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتہ بتاتے ہیں کہ سنہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ اُن کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا۔ اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی لئے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلّی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف۔ اہلِ قلم۔ اہلِ حرفہ اور نجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جُلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہوگیا۔ اُسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اسکے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہوگئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو

وسعت دے کر یہ کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اُسی وقت سے ان کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام مل گیا۔ اس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اُس میں بھی ضرور ہوں گے۔

بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مِل جُل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اُس سے مل گئی عربی، فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اِس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اِس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اِسی زبان کو ریختہ[1] بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اُسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونہ سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی، پریشان چیز۔ چونکہ اِس میں لفظ پریشان جمع ہیں اِس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک وقت ہوگا کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ایک خاندانی نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے۔ یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے

---

[1] پہلے شعرا اُردو کو ریختہ کہتے تھے۔ میر عفر غینی کی تقریر میں دیکھو صفحہ ۲۵۔ مرزا رفیع فرماتے ہیں:۔

ع شعر بے معنی سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ۔ اور دیکھو صفحہ ۱۰۸۔

اس پر رنگ چڑھے نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے۔ فقط دوستانہ بے
بے تکلفانہ باتیں ہیں۔ "بڑے آکا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے
کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں۔ کوٹ اور واسکٹیں
نئی تھیں۔ کنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے۔ کرسیاں۔ میزیں چقیں باریک خوش
رنگ تھیں۔ میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں۔ منجھلے آکا بولے۔
جانے بھی دو جس مال نے مالک سے وفا نہ کی، ہم سے کیا وفا کرے گا۔
آتے ہوئے ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں کھتے مرزا جان چلے آتے ہیں
شرم ٹھہرا کر بڑے تپاک سے ملے۔ بڑھاپے نے بچارے کا رنگ روپ
سب کھو دیا۔ وہ شکل ہی نہیں۔ وہ صورت ہی نہیں۔ کیسے گورے چٹے سجیلے
جوان تھے۔ لوگ تصویریں اتروا تے تھے۔ میں نے کہا۔ میاں ہم نے تو جانا
تھا تم وکن سے خوب چاق چوبند۔ سُرخ سفید ہو کر آؤ گے۔ تم تو سوکھ کر
قاق ہو گئے۔ غضب کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولے
"ہائے جوانی"۔

فارسی، عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چق۔ چاق
قاق۔ آکا ترکی ہیں۔ میز[1] نامعلوم۔ نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا اطالی ہے۔ ڈپٹی۔
ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنٹر۔ گلاس انگریزی ہیں۔ چٹا۔ کھتا پنجابی
ہے۔ مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے۔ اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے
نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھتا پنجابی میں عام ہے۔ خاص صفت کے

---

[1] میز دری زبان میں ترجمہ ٹیبل کا ہے۔ مگر اردو کو یہ لفظ فارسی مروجہ سے نہیں ملا۔ صاحب لوگوں سے پہنچا ہے

ساتھ بولتے ہیں۔ بھانڈا پھوڑنا اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں۔ پنجابی میں کھینچ کر باندھنے یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر پکڑو۔ بھنانا بھنانا توڑنا اور تڑوانا ہے۔ اور اسی سبب سے پنجابی میں روپے کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اُردو میں پہلے معنے متروک ہو گئے۔ دوسرے معنے رہے وہ بھی رکو کر کے کہہ جاؤ۔ روپے کے ٹکے بھنالاؤ۔ اور اس اصلیت کا سُراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں۔ اور اُردو میں بھی کہتے ہیں۔ صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا۔ دوپہر کو دیکھو تو برکت! یعنی سب پیسے اُٹھ گئے۔

کسوٹی۔ گھسنا۔ مرادف فرسودن اُردو میں بالکسر ہے۔ پنجابی میں اسطرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے۔ اور ہ کا تلفظ عجیب ہے کہ انہی کے لہجے کے لئے خاص ہے۔ بہرحال اس سے کسّ وٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا۔ اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہو گیا۔

رُوپ۔ سجیلا۔ جوبن۔ گنوایا۔ برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرہ کی باتوں پر خیال کرو۔ یوسفؑ۔ ہارونؑ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ وغیرہ عبرانی ہیں۔ کیمیا فیلسوف۔ اصطرلاب یونانی ہیں۔ اُڑد یعنی ماش تامل ہے۔ نتھا۔ یعنی خورد گجراتی ہے۔ بڑا جو کڑھائی میں تلتے ہو۔ تلنگو ہے۔ گدام۔ ملایا کی زبان ہے۔ تماکو امریکہ کا لفظ ہے۔ یورپ کے رستے ہو کر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا۔

اُردو میں اسوقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو۔ میر جعفر زٹلی کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانے کا

نمونہ کہتا۔ مگر زٹل کا اعتبار کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی اسکے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالبًا یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہوئے۔ اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آدے۔ لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا۔ اور بیابان تامل وتدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ نسیم عنایت الہٰی دلِ افگار پر اہتزاز میں آ۔ یہ بات آئینہ خاطر میں دکھائی۔

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے افسوس کہ اسوقت موجود نہیں۔ اس کا انداز بالکل یہی ہے لیکن چند فقرہ سودا کے ایک دیباچہ سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں **نثر مرزا رفیع** "ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے میرہن ہو کہ عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ، خامہ دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں۔ تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہیں ؎

قیمت و قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم ورنہ دنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینے میں بیش از مرغ اسیر نہیں، کہ ہو نہیچ قفس کے۔ جسوقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا دُر منصفی زینت

ب ہے سر رشتہ حسن و معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر
حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے
تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے، چاہیئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی
کرے ورنہ گندم زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے۔"

اس تصنیف سے تخمیناً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشاء اللہ خاں اور مرزا
جان جاناں مظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس گفتگو کے چند فقرے
بھی قابلِ غور ہیں۔ سید انشاء مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں۔

سید انشا فرماتے ہیں

ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان، اور اوائل ریعان سے الی الآن
اشتیاق مالایطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا۔ کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم
ہو سکے۔ لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں

اپنے تئیں کو بھی بدو طفلی سے تمھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست
اور مجالست رہا کی ہے۔ مرزا جان جاناں کا جواب

لیکن میر غضر غینی کے نام سے ایک گفتگو سید انشاء نے دریائے لطافت
میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے کہ اس صاحبِ کمال نے یہ زبان کس
فصاحت کے مطالب میں ڈھالی تھی۔ کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین آسمان
کا فرق ہے۔ شاید مرزا جان جاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہو گی
تقریر کا انداز اور ہو گا۔

بہرحال اسوقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعتِ زبان اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات۔ غزلیں۔ عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے۔ اور غرض اُن سے فقط اتنی تھی کہ امرا و اہلِ دول سے انعام لے کر گذارہ کریں۔ یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی۔ کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ تھوڑے عرصے میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ کہ ہر شخص سمجھتا تھا اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ وا لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نوطرز مرصع نام رکھا شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ سنہ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۲ء نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

اِدھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۲۱۴ھ ۱۷۹۹ء میں میر شیر علی افسوس نے باغ اردو اور سنہ ۱۲۲۰ھ ۱۸۰۵ء میں آرائش محفل لکھی۔ میر امن نے سنہ ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلگرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی۔ سنہ ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں شری للوجی لال کوی نے

پریم ساگر[1] لکھی اور بیتال پچیسی[2] جو محمد شاہ کے زمانے میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشا اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں قواعد اُردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔

عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اسکے مولوی اسمعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اُردو میں لکھے۔

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دہلی میں جاری ہوا۔ اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے۔ دفتری زبان بھی یہی ٹھہری۔ اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سنہ سے دلی میں سوسائٹی قایم ہو کر ترجمے ہونے لگے اور ضرورت علمی الفاظ بہم

---

[1] پریم ساگر سمت ۱۸۶۰ میں بھاشا ہوئی۔ [2] بیتال پچیسی ۱۸۰۵ء میں مظہر علی ولا نے اردو میں لکھی۔

پہنچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا۔ اور اس کی وسعت کا میدان کیا۔ البتہ اب اُمید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلے میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو اسقدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائیگا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے۔ یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالک فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانہ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا وغیرہ جو کہ اُردو کے بزرگ ہیں اُن کے خزانے میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں۔ اور اس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں۔

بحث بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے

جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ و روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے۔ اگرچہ اسکے اثر۔ گفتگو۔ لباس۔ خوراک نشست برخاست۔ مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے اس لئے اسی میں گفتگو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم

دوسری قوم میں آتی ہے۔ تو اپنے ملک کی صدھا چیزیں ایسی لاتی ہے جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیائے مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ انھیں غنیمت سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور بخوشی کام میں لاتے ہیں۔ ان اشیاء میں سے بہتیری چیزیں تو نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ اور بہتیری نئی ترکیب سے یا اول بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں۔ اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہہ کر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبع انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں۔ مگر انداز بیان سب کا جدا جدا ہے۔ اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے ادائے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں۔ لطیف استعارے لے کر اپنی پرانی تشبیہوں اور مستعمل استعاروں کا رنگ بدل لیتے ہیں اور جسقدر زبان میں طاقت ہے۔ ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں۔

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گزرتا ہے۔ چنانچہ قوم عرب جو ایک زمانے میں روم۔ یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی۔ ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے۔ اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ

الفاظ سے مالامال نظر آتی ہے۔ انگریزی کے باب میں مجھے کچھ کہنا زیبا نہیں۔ کیونکہ اب روشنضمیر انگریزی خواں بہت ہیں۔ اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذب سلطنت میں تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ لیکن اتنا پھر یاد دلانا واجب ہے کہ اردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے۔ اردو زبان اوّل لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی محمد شاہی دور تھا اور عیش و عشرت کی بہار تھی ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشا پردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہماری یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں۔ چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اردو میں اتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جو کچھ قوتِ بیان یا لفظوں کی تراش یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی۔ غرض اوّل جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا۔ اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ اس سے زبان مفلس رہی۔ کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ فلسفہ۔ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے ہیں

جن جن باتوں کا چرچا تھا انہی سانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔ ہاں یہ کہنا ضرور چاہیے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پہ خوب ہوا تھا۔

اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہیے کہ بھاشا نے اُردو کے کپڑے پہننے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا۔

(۱) اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں۔ مثلاً لباس میں فرغل۔ لبادہ۔ کرتہ۔ قبا۔ چوغا۔ آستین۔ گریبان۔ پائجامہ۔ ازار۔ عمامہ۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ۔ تکیہ۔ گاؤ تکیہ۔ برقع۔ پوستین وغیرہ۔

کھانے کے ذیل میں:۔ دسترخوان۔ چپاتی۔ شیرمال۔ باقرخانی۔ پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ۔ متنجن۔ فرنی۔ یاقوتی۔ حریرہ۔ حلیم۔ لوز۔ مربّیٰ۔ اچار۔ فالودہ۔ گلاب۔ بیدمشک۔ خوان۔ طبق۔ رکابی۔ تشتری۔ کفگیر۔ چمچہ۔ سینی۔ کشتی۔ چائے جوش وغیرہ۔

متفرقات میں:۔ حمام۔ کیسہ۔ صابن۔ شیشہ۔ شمع۔ شمعدان۔ فانوس۔ گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ۔ مشک۔ نماز۔ روزہ۔ عید۔ شب برات۔ قاضی۔ ساقی۔ حقہ۔ نیچہ۔ چلم۔ تفنگ۔ بندوق۔ تختہ نرد۔ گنجفہ، اور اس کی اصطلاحیں۔ یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں اُن کے لئے نام نہیں۔ سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے پستہ۔ بادام۔ منقیٰ۔ شہتوت۔ بیدانہ۔ خوبانی۔ انجیر۔ سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ۔

(۲) بہت سے عربی، فارسی کے لفظ کثرتِ استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں۔ کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے، یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام کو

بہت چیزیں باہر سے آئیں اور نام اپنے ساتھ لائیں

کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ مثلاً دلال۔ فراش۔ مزدور۔ وکیل۔ جلاد۔ صراف۔ مسخرا۔ نصیحت۔ لحاف۔ توشک۔ چادر۔ صورت شکل۔ چہرہ۔ طبیعت۔ مزاج۔ بدرق فاختہ۔ قمری۔ کبوتر۔ بلبل۔ طوطا۔ پر۔ دوات۔ قلم۔ سیاہی۔ جلاب۔ رقعہ۔ عینک صندوق۔ کرسی۔ تخت۔ لگام۔ رکاب۔ زین۔ تنگ۔ پوزی۔ نعل۔ کوتل۔ عقیدہ وفا۔ جہاز۔ مستول۔ بادبان۔ درہ۔ پردہ۔ دالان۔ نعمت خانہ۔ تنخواہ۔ ملاح۔ تازہ۔ غلط صحیح۔ رسد۔ سرباری۔ کاریگر۔ ترازو۔ شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے۔ مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزاء کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی۔

سینکڑوں لفظ عربی، فارسی کے یہاں آئے، مگر ہوا موافق نہ آئی۔ اسلئے مزاج اور صورت بگڑ گئی۔ مثلاً مرغا وغیرہ۔ دیکھو صفحہ ۳۸

صرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔ خود اتنا کیا کہ و، ن علامت جمع ہندی کو عربی، فارسی لفظوں پر بھی لگا لیا۔ مثلاً آدمیوں انسانوں۔ درختوں۔ میووں۔

اسم فاعل۔ فارسی، عربی کے بے شمار لئے۔ اور ان میں شطرنج باز کے قیاس پر۔ چوپڑ باز۔ اور وفادار کے قیاس پر ظرفا سمجھدار، سمجھ ناک بھی بول دیتے تھے۔ باغبان کے قیاس پر۔ گاڑیبان۔ ہاتھی بان۔ بہلبان۔ نگہبان۔ اور وان حقیقت میں ایک ہیں۔ کیونکہ اصل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی تحقیق جیسی کہ چاہیئے۔ فارسی لکچروں میں لکھی ہے۔

اسم ظرف۔ قلمدان، وغیرہ کے قیاس پر خاصدان۔ پاندان۔ ناگردان۔

بہت چیزیں ہندی کی تھیں مگر اسلئے ہندی نام کھو بیٹھیں

صرف میں بھی فارسی نے ہندی پر کیا اثر کیا

پیک دان۔ مودیخانہ۔ پنجانہ۔

باب حروف۔ کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً حرف تشبیہ کوئی نہیں لیا۔ مگر۔ چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں۔ اور اس طرح آتے ہیں کہ ترجمہ کے لئے ہندی حرف معلوم ہی نہیں ہوتا۔

حرف شرط میں اگر۔ اور اس سے اگرچہ بھی لیا۔

واو عاطفہ سمیت۔ معطوف۔ اور معطوف علیہ۔ اردو عبارت میں لے لئے۔ مثلاً آب وہوا۔ شب و روز۔ صبح وشام۔ زور وشور۔

حرف استثنا میں سے مگر۔ اور عربی کے لفظ سوا۔ ماسوا۔ اِلّا۔ واِلّا نہ۔ لیکن۔ ولیکن کے لئے۔ اپنے حرفوں کو کم کر دیا۔

حروف نفی۔ نا اور نہ کی جگہ۔ نہ اور نے آ گئے۔

حروف ایجاب۔ رہے۔ مگر ادب کی جگہ میں۔ سنت بچن وغیرہ کی جگہ۔ بجا۔ درست۔ واقعی۔ حق۔ بے شک۔ برحق۔ بہ سروچشم آ گئے۔ اصل زبان کے لفظ نہ رہے۔

حرف تاکید۔ کی جگہ۔ ہرگز۔ زنہار۔ ضرور۔ البتہ آ گئے۔ اصلی لفظ گم ہو گئے

حروف تردد۔ کی جگہ۔ یا۔ خواہ۔ ہیں۔ اصل گم۔

حروف تمنا میں سے کوئی حرف نہیں۔ کاش فارسی کا حرف ہے۔

حروف ترقی میں بل تو نہیں بولتے۔ مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے۔

اسم کی بحث۔ میں اسمار اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر از آنجا کہ۔ با آنکہ۔ با اینکہ مرکب ہو کر بہت آتے ہیں۔

موصولات میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر کاف بیانیہ اس طرح آنے لگا کہ بے اسکے کلام ہی بے مزہ ہوجاتا ہے۔ کیسا۔ ایسا۔ جیسا کی جگہ کس طرح وغیرہ کس وضع وغیرہ۔ کتنا۔ اتنا۔ جتنا کی جگہ۔ کسقدر وغیرہ بھی بولنے لگے۔

یائے نسبت۔ کی ترکیبوں میں فارسی۔ عربی کے بموجب نسبتی الفاظ بولنے لگے۔ چنانچہ دلّی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں۔ اسی طرح اور الفاظ ہیں۔ اور عورتوں میں شیخانی۔ سیدانی۔ اُستانی وغیرہ وغیرہ۔

باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے۔ مگر صدہا مصادر مرکبہ بنائے مثلاً ماننا۔ اب کہتے ہیں ہرچند سمجھایا۔ اُس نے منظور نہ کیا۔ کسی عنوان قبول نہ کیا یعنی نہ مانا۔

مُکرنا۔ اب کہتے ہیں۔ پہلے تو قبول دیا تھا۔ پھر انکار کر گیا۔ یعنی مُکر گیا۔

سوچنا۔ اب کہتے ہیں۔ ہرچند فکر کرتا ہوں عقل کام نہیں کرتی۔

پچتانا۔ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ یعنی پچتایا۔

اسی طرح خوش ہونا۔ غصے ہونا۔ خفا ہونا۔ تنگ ہونا۔ دِق ہونا۔ غمگین ہونا تماشہ دیکھنا۔ سیر کرنی۔ انتظار کرنا۔ راہ دیکھنا۔ یہانتک کہ بہتیرے مصدروں کی اصل ہندی ہوگئی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ عربی فارسی کے مصدر یا مشتقات لیکر ہندی کا اشتقاق کر لیا۔

گزشتن۔ سے گذارنا۔ اور اس کے افعال۔ محاورہ ہے کہ گئی گذری بات کا اب کیا کہنا۔

فرمودن سے فرمانا۔ اور اس کے بہت سے افعال۔
قبول سے قبولنا محاورہ ہے۔ بڑا بادی چور تھا۔ ہر گز نہ قبولا۔
بدل سے بدلنا۔ اور اس کے بہت سے افعال۔ محاورہ ہے کہ اُدلے کا بدلہ ہے صاحب۔
بخشیدن سے بخشنا۔ لرزیدن سے لرزنا۔
نواختن یا نوازش سے نوازنا۔ شرم سے شرمانا
کاہل۔ سے کہلانا۔ میاں مجبور ایک قدیمی شاعر تھے۔ استاد مرحوم اُن کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کہ بڈھے دیرینہ سال تھے۔ مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں غزل پڑھی۔ دیکھنا کس خوبصورتی سے فعل مشتق کو بٹھایا ہے۔

س: باتیں دیکھ زمانے کی جی بات سے بھی کہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

نحو میں ترکیب اضافی۔ ترکیب توصیفی۔ کہیں مبتدا کہیں خبر ہو کر تمام ہندی پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو بھی اس کے لئے جمع لاتے تھے۔ اب واحد لاتے ہیں س

ملایم ہو گئیں دل پر برہ ساعتیں کڑیاں
پہر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں!

اب گھڑی ساعتیں بولتے ہیں۔
تیسرے صیغہ مضارع۔ بمعنے حال۔ سود اس

نالہ سینے سے کرے عزمِ سفر آخرِ شب   راہ رُو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخرِ شب

چوتھے یہ کہ اقسامِ اضافت میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہوگئی۔ چنانچہ بھاشا میں کہنا ہو تو کہیں گے۔ راج کنور کے دل کی کملاہٹ دربار کے لوگوں سے نہ دیکھی گئی۔ اُردو میں کہیں گے شہزادہ کے غنچۂ دل کی کملاہٹ اہلِ دربار سے نہ دیکھی گئی۔

ولی وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرعے فارسی کے ہیں۔ مگر کچھ اور طرح سے علیٰ ہذا القیاس۔ بھاشا کے الفاظ اور اس کی ترکیبیں بھی زیادہ ہیں۔ اور اسطرح ہیں کہ آج لوگوں کو فصیح نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس ملائی مگر وہ ابھی اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصا میٹھا ایک بالکل پھیکا ہے۔ پھر ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی ہاں اب گھل مل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا جسے شیر و شکر کہتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں۔ اُردو خواہ مخواہ طبیعت کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میری عقل دونوں باتوں سے حیران ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کہے آج ایک شخص آیا تھا۔ یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا تو دونوں یکساں ہیں۔ کیونکہ کہوں کہ منش مخالف طبع ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم بچپن سے شخص سنتے ہیں اس لئے ہمیں منش یا مانس۔ نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اور الفاظ جن کی تعداد شمار سے باہر ہوگئی ہے۔

اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ بہت سے لفظ خود متروک ہیں۔ مگر دوسرے

لفظ سے ترکیب پاکر ایسے ہو جاتے ہیں کہ فصحا کے محاورے میں جان ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہی مانس کہ اکیلا محاورے میں نہیں۔ مگر اب سب بولتے ہیں کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے، باطن کی خبر نہیں۔ بندھو بھاشا میں بھائی۔ یا دوست کو کہتے ہیں۔ اب محاورہ میں بھائی بند کہتے ہیں، نہ فقط بھائی بندھو ان استعمالوں کی ترجیح کے لئے دلیل کسی کے پاس نہیں۔ جو کچھ جس زمانے میں رواج ہو گیا وہی فصیح ہو گیا۔ اک زمانہ آئے گا کہ ہمارے محاورے کو لوگ بے محاورہ کہہ کر ہنسیں گے۔

اگرچہ یہ بات بغیر تمثیل دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال میں نقش ہے کہ سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اُردو کا پُتلا بنا ہے باقی اور زبان کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔ مگر میں چند لفظ مثالاً لکھتا ہوں۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو میں آئے تو اُن کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیونکر صورت بدلی ہے۔

(۱) چورن سنسکرت ہے۔ یعنی آٹا۔ بھاشا میں چون کہتے ہیں۔ اُردو میں چورن پسی ہوئی دوا کو کہتے ہیں۔ اور کٹی ہوئی چیز کے نیچے جو باریک اجزا رہ جائیں وہ چورا ہے۔

(۲) پشٹ سنسکرت ہے۔ برج بھاشا میں پسان۔ اسی سے ہے پسنہاری اُردو میں مٹھی پسی ہوئی دال کے لئے خاص ہو گئی۔ اور پسنا مصدر ہو گیا

(۳) اَٹ۔ جسے برج بھاشا اور اُردو دونوں میں آٹا کہتے ہیں۔

(۴) وارتا۔ یا ورت۔ اُردو میں بات ہو گئی۔

(۵) چترِ دھر۔ اُردو میں چودھری ہوگیا۔

(۶) چندر۔ چاندری۔ سنسکرت ہے۔ اُردو میں چاند اور چاندنی ہوگئی

(۷) (گدھ) گرِھ۔ گھر یعنی خانہ۔ اور کیا عجب ہے کہ فارسی میں کد۔ یا کدہ بھی یہی ہو۔

(۸) ہست۔ ہاتھ ہے۔

(۹) ہستی۔ کا ہاتھی ہوگیا۔

(۱۰) بازد۔ سنسکرت ہے۔ بھاشا۔ بادر۔ اُردو بادل۔ یعنی ابر ہوگیا۔

(۱۱) دَل۔ ایک ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔ بھاشا اور اُردو دال خاص غلہ کے لئے اور دَلنا مصدر نکل آیا۔

(۱۲) کشیر۔ دُودھ۔ بھاشا۔ کھیر۔ یا چھیر۔ اُردو میں۔ دودھ چاول سے تیار ہوئی ہے

(۱۳) دُگدھ۔ سنسکرت ہے۔ بھاشا دُدّھ۔ اب اُردو میں دُودھ کہتے ہیں۔

(۱۴) ماش۔ یا ماکھ۔ ماس اُردو میں مہینہ ہوگیا۔

(۱۵) گانڈا۔ اُردو میں گنا ہوگیا۔ مگر گنڈیری میں ڈال باقی رہی۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دئے۔ اُردو نے کہیں تو لفظوں ہی میں کچھ تصرف کیا معنی وہی رکھے کہیں لفظوں کو سلامت رکھا معنی کچھ سے کچھ کر لئے۔ مثلاً:۔

فیلسوف۔ یونانی لفظ ہے۔ بمعنی محب الحکمت۔ جیسے عربی میں حکیم۔ اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوزفر کہتے ہیں۔ مگر اُردو والے دغاباز اور مکار کو کہتے ہیں۔ اور فیلسوفی۔ مکاری۔

ابا۔ اماں۔ اب اور ام سے نکلے ہیں۔

عربی فارسی کے لفظ کے معنوں میں تصرف کر لیا اور کہیں الفاظ میں

خصم۔ عربی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے۔ مگر اُردو میں نما و تند بمقابل جورو کے ہے جس سے زیادہ کوئی دنیا میں عزیز نہیں۔

تماشا۔ سیر۔ عربی میں فقط بمعنی رفتار ہے۔ اردو میں کہتے ہیں۔ چلو باغ کی سیر دیکھ آئیں۔ عجب تماشا ہے۔

اخلاص۔ عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں۔ اُردو والے پیار۔ اخلاص۔ محبت ایک معنوں میں بولتے ہیں۔

خیرات۔ عربی لفظ ہے۔ یعنی نیکیاں۔ اُردو میں خیرات دو۔ صدقہ اتارو۔

تکرار۔ عربی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اُردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں۔

طوفان۔ عربی لفظ ہے۔ فارسی میں کسی شے کی حالتِ افراط کو کہتے ہیں۔ اُردو میں بمعنی تہمت بھی آتا ہے۔

خفیف۔ عربی میں ہلکی شے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں کہتے ہیں۔ وہ مجھ سے ذرا ملے تو سہی دیکھو کیسا خفیف کرتا ہوں۔ یعنی شرمندہ۔

مصالح۔ جمع مصلحت۔ یا مَصلَح کا مخفف ہے۔ اُردو میں گرم مصالح وغیرہ اور سامانِ عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں۔

خاطر۔ عربی فارسی میں دل یا خیال کے موقع پر بولتے ہیں۔ اُردو میں کہتے ہیں کہ بھلا ایک گھونٹ تو ہماری خاطر سے بھی پی لو۔ یا ان کی بڑی خاطر کی۔

دستوری۔ جن معنوں سے یہاں بولتے ہیں۔ یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ پنجابی میں جھونگا کہتے ہیں۔

روزگار۔ فارسی میں زمانے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں روزگار نوکری ہے۔

رومال۔ جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں۔ یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں روپاک یا دست پاک ہے۔

خیر وصلاح۔ عوام الناس خیر سلا کہتے ہیں۔ یعنی صحت وسلامت۔

رنڈ۔ اگرچہ فارسی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اہلِ فارس ان معنوں میں نہیں بولتے۔ بہت الفاظ اس طرح لئے کہ معنوں کے ساتھ ان کی صورت بھی بدل دی۔ اگرچہ اکثر ان میں سے عوام الناس بولتے ہیں۔ مگر بعض الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی پہنچ گئے۔ مثلاً:۔

عربی فارسی کے لفظ کی صورت اور معنی دونوں میں تصرف کیا۔

ارداوہ کہ اصل اردابہ تھا۔

شُروا۔ شوربا۔ یا شورابہ۔

کھیسا۔ کیسہ۔

کہگل)۔ کاہ گل۔

مُردارسنگ۔ مُردہ سنگ

گذری۔ گذری۔ بازار وقتِ شام۔

بجاوہ۔ پزاوہ۔ پزیدن سے۔

تاٹ بافی۔ تار بافی۔

زری گوٹا۔ زری کہنہ

تار تلا۔ تار طلا یعنی زری کہنہ

ہمام دستہ۔ ہاون دستہ۔

بجاز۔ بزاز۔

قبور۔ قربوس

دسپناہ۔ دست پناہ یہیں کی فارسی ہے

تانے تشنے۔ طعن وتشنیع۔

بک بک جھک جھک۔ زق زق بق بق

توبہ تنسوہا۔ توبۃً نصوحا

تاشہ۔ تاسہ اور تاسک فارسی لفظ ہے

سپہ بندی۔ سپہ بندی۔ نونگہداشت۔ یعنی

غُرفش۔ غرش۔

افراتفری۔ یعنی افراط وتفریط اصل میں نہایت بہتات۔ اور نہایت کمی کے معنی ہیں

اب کہتے ہیں عجب افراتفری پڑ رہی ہے یعنی ہل چل پڑ رہی ہے۔
قلانچ۔ قلاش یا قلاچ۔ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اس لئے کپڑا ناپنے کا پیمانہ ہے۔ یہاں خرگوش یا ہرن جانور دوڑتے ہوں تو کہیں گے کہ قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں۔

ذوق ؎ وحشی کو دیکھا ہم نے اُس آہو نگاہ کے
خنگل میں بھر رہا تھا قلانچیں ہرن کے ساتھ

آکا۔ ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں آکا یار دوست کو بولتے ہیں۔ اور اس میں کچھ بانکپن کو بھی دخل ہے۔
قیورق۔ ترکی میں شے محفوظ کو کہتے ہیں۔ یہاں جو شے حاکم کی ضبطی میں آئے اُسے قُرق کہتے ہیں۔
مشاطہ۔ مُشط عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں۔ فارسی میں مشاطہ اُس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کروائے۔ جیسے ہندوستان میں نائن۔ اُردو میں بضم اوّل۔ اور بتخفیف ثانی۔ اُس عورت کو کہتے ہیں جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے، اور شادی کروادے۔
مُرغلا فارسی میں مُرغ فقط پرندہ ہے۔ اُردو میں مُرغا۔ خروس۔ مُرغی ماکیان کو کہتے ہیں اور ان کے ہاں ہر جمعہ کو مرغوں کی پالی بندھتی ہے۔
چغہ۔ یا چق۔ ترکی میں باریک پردے کو کہتے ہیں۔ یہاں چلمن کو۔ چک کہتے ہیں۔
کتّا۔ ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں۔ یہاں کٹا موٹے کو کہتے ہیں۔ ہٹا کٹا محاورہ ہے

نظر۔ بالتحریک ہے۔ مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں۔ وزیر سے

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

خط۔ مشدد ہے۔ مگر اب کہتے ہیں۔ آجکل خطوں میں آداب والقاب کا دستور ہی نہیں رہا۔ کسی استاد کا شعر ہے

صاف تھا جتبک کہ خط جب تک جواب صاف تھا
اب تو خط آنے لگا۔ شاید کہ خط آنے لگا

غم۔ بھی عربی میں مشدد ہے۔ فارسی اور اردو میں بالتخفیف بولتے ہیں۔

طرح۔ عربی بالتسکین ہے۔ اردو کے اہل محاورہ اور شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں۔

محل۔ بالتشدید ہے۔ مگر کہتے ہیں کل بولی بھٹیاری کے محلوں پر بسنت ہے

بولی بھٹیاری۔ کوئی بو علی بختیاری کا مخفف و بدل کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے بھولی بھٹی کا۔

بجے منڈل۔ بدیع منزل کا محفف و مبدل ہے۔ دلی کے باہر شاہان قدیم کی تعمیرات سے ایک مشہور عمارت ہے۔

مرزا احسن کو پیار سے مرزا سنو کہتے ہیں۔ اور یہاں سن کو ساکن ہی بولنا فصیح ہے

کلمہ۔ لام کی زیر سے ہے۔ محاورہ میں سکون لام بھی بولتے ہیں۔ اور وہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جرأت نے کیا خوب کہا ہے

کلمہ بھرے ترا جسے دیکھے تو بھر نظر
کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ کا

نشاہ۔ اہل محاورہ اسے بھی نشہ کہتے ہیں۔ ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔

جتنے نشے ہیں یاں روشِ نشہ خراب
ہو جاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں
کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُسکے میر
سمندِ ناز کو اِک اور تازیانہ ہوا

اس طرح سیکڑوں لفظ ہیں جن کی تفصیل بے فائدہ طویل ہے۔

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے۔ ہندو مسلمان بھائیوں کو اس دن کا انتظار چاہئے کہ عربی فارسی کے لفظ جو اب تک ہمارے تمہارے باپ دادا بولتے رہے۔ ائندہ ان کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے

چند لفظ ایسے بھی دکھلانے چاہئیں جو کہ مختلف ممالک یورپ کے ہیں۔ اور اب ہماری زبان میں اس طرح پیوند پا گئے کہ جوڑ تک نہیں معلوم ہوتا مثلاً

کمرا۔ اطالی ہے۔ فرانیل۔ یا فلالین۔ فلینن انگریزی ہے۔
نیلام۔ پرتگالی ہے۔ وہ لیلام کہتے ہیں۔ بانات۔ بابی نٹ۔ ایک جالی کی قسم کا کپڑا۔
پادری۔ زبان لاطینی سے آیا ہے۔ بوتل۔ باٹل انگریزی ہے۔
لالٹین۔ لین ٹرین انگریزی ہے۔ درجن۔ ڈزن انگریزی ہے۔
اسٹامپ۔ سٹمپ انگریزی ہے بٹن۔ بٹن انگریزی ہے۔
بسکٹ۔ بسکٹ انگریزی ہے۔ بگی۔ انگریزی ہے۔
پنشن۔ انگریزی ہے۔ گلاس۔ انگریزی میں عام شیشہ ہے۔
بوتام۔ بوتان فرنچ ہے میم۔ میڈم انگریزی ہے۔
پستول۔ پسٹل انگریزی ہے۔ اردلی۔ آرڈرلی۔ انگریزی ہے
اسی طرح اسٹیشن۔ ٹکٹ۔ ریل۔ پولس وغیرہ صدہا الفاظ ہیں کہ عام

عام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہنچ گئے ہیں۔ اور جو الفاظ دفتروں اور کچہریوں میں صاحب لوگوں کے ملازم بولتے ہیں۔ اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بن جائے۔

اردو نے کونسی ایجادی اصطلاحیں بنائیں

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے۔ کہ اپنی زبان میں تصرفات لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اُردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر ان لوگوں کی طبیعت سے ہوتی ہے، جو علم کے ساتھ فکر عالی طبیعت براق۔ ذہن پُر ایجاد، اور ایجاد دلپذیر رکھتے ہیں۔ انہی کے کلام کو خاص و عام کے دلوں میں اثر ہوتا ہے کہ بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی ہے۔ اور اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً:۔

گھوڑے کا رنگ جسے ہندوستان میں سُرنگ اور پنجابی میں چینا یا ککا کہتے ہیں۔ فارسی میں اُسے کرنگ کہتے ہیں۔ چونکہ بھاشا میں کُ علامت بدی اور سُ علامت خوبی ہے۔ اس لئے اکبر نے اسکا نام سُہرنگ رکھا

گھوڑے کی اندھیری کا نام اُجیالی رکھا کہ نیک شگون ہے خاکروب کو حلال خور کا خطاب بھی اسی ذرہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوا ہے۔

جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اسکو فارسی کے شعرا نے اشعار میں بدھا۔ طالب املی سے

نہ ایم منکر صہبا ولیک میگویم   کہ رام رنگی ما نشۂ دگر دارد

سنگترہ کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا۔ بُلبل ہندوستان کا گلدم نام رکھا۔

ھار کے لفظ کو بدشگون سمجھ کر پھلمال کہوایا۔

شاہ عالم نے سرخاب کو بھی گلسرہ کہا۔ مگر اس نے رواج نہ پایا۔
نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاق سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لئے کیسی گنجائش طبیعت رکھتی ہے۔ نظم و نثر پر غور سے نظر کرو۔ اس نے اپنے مہمان کے لئے فقط لفظوں ہی میں جگہ خالی نہیں کی بلکہ بہت سے الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیت عربی فارسی سے رکھتے تھے وہ بھی لے لئے۔ چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا۔ حالانکہ یہاں وہ بھیم اور ارجن کا حق تھا۔ سودا کہتے ہیں ؎

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا
رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے دہر مر دے

حسن و جمال کے شبستان میں لیلےٰ و شیریں آ گئیں اور جب وہ آئیں تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیونکر نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی آنکھوں سے گنگا جمنا تو بہ نہیں سکیں۔ مجبوراً جیحوں، سیحوں ہندوستان میں آ گئے۔ ہمالچل اور بندھیاچل کو چھوڑ کر۔ کوہ بیستون۔ قصر شیریں۔ کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھولوں سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے۔ اور وہ عجب بہار دیتے ہیں۔

ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی اٹھ گیا۔ اور اپنے کار آمد

خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انھیں کبھی بجنسہ اور کبھی ترجمہ کر کے لے لیا مثلاً بر آمدن اور بر سر آمدن۔ ہندی میں اسکا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہلِ زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین کر لیا۔ اور سودا نے کہا۔ ع

اِس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے
بجلی کو دم سرد سے جسکے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہے کہ اُس سے بسر آئے
وہ زلفِ سیہ اپنی اگر لہر پر آئے

در آمدن - یعنی گھس آنا۔ سودا سے

یاں تک تُو دل آزار خلایق ہو کہ کوئی
مل کر لہو مُنہ سے صفِ محشر میں در آئے

عرق عرق شدن - اور آب شدن۔ ذوق سے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائینگے

حرف آمدن اور دل خوں شدن۔

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اِس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

سید انشا۔ ع لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پر حرف ہے۔

چشمک زدن۔ ذوق سے

لب پر ترے پسینہ کی بوندا ے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سُہیل یمن کے ساتھ

پیمانہ پُر کردن ۔ مار ڈالنا۔ سودا ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا
پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

دامن افشاندہ برخاستن۔ بیزار ہو کر اُٹھ کھڑے ہونا۔ سودا ؎

کیا اس چمن میں آن کے لے جائیگا کوئی
دامن تو میرے سامنے گُل جھاڑ کر چلا

از جامہ بیرون شدن۔ سودا ؎

نکلا پڑے ہے جامے سے کچھ اندنوں رقیب
تھوڑے ہی دم دلاسے سے اتنا اُبھر چلا
کب صبا آئے تیرے کوچے سے اے یار کہ میں
ذوق
جوں حبابِ لب جو جامہ سے باہر نہ ہوا

فلکش خبر ندارد۔ یہ محاورہ بھی اہل ہند کا نہیں کیونکہ یہاں آکاس ہے فلک نہیں ہے۔ اہل ہند اسکا مضمون کیوں باندھتے۔ مگر سودا کہتے ہیں ؎

تجھ رخ میں ہے جو لطف ملک کو خبر نہیں
خورشید کیا ہے اسکے فلک کو خبر نہیں

دل از دست رفتن۔ بے اختیار ہو جانا۔ سودا کا مصرع ہے ؎

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھو محبوباں کی چال

دل دادن۔ عاشق ہونا۔ ظفر ؎

دل دے کے تم کو جان پہ اپنی بُری بنی
شیریں کلامی آپ کی میٹھی چھُری بنی

میر صاحب۔ ع ایسا نہ ہو دل دادہ کوئی جان سے گذر جائے

از جاں گزشتن۔ جان پر کھیل جانا۔ ظفر کا مصرعہ ہے۔ ع

وہاں جائے وہی جو جان سے جائے گزر پہلے

از سر چیزے گزشتن۔ دست بردار ہونا۔ سید انشا ع

خدا کے واسطے گذرا میں ایسے جینے سے

ذوق علیہ الرحمتہ ؎

پہنچیں گے رہگذر یار تلک کیونکر ہم
پہلے جبتک نہ دو عالم سے گذر جائینگے

آصف الدولہ ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گذرے
تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

سودا ؎

چاہے تجھے چشم آکے جو ہو بادام سفید
کھینچکر پوست کرے گردشِ ایام سفید

سفید شدن پوست کشیدن۔ بھی فارسی کا محاورہ ہے۔ جسکا ترجمہ انہوں نے کر لیا ہے۔ اردو میں کھال اتارنا۔ ناسخ ؎

بھا گئی کون سی وہ چیز بتوں کی ہم کو
نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورے کا ہے کہ نہ کمر دارند۔ نہ دہن دارند۔ ہندی کا محاورہ بھی ہے۔ کہ نہ کمر ہے نہ دہن ہے۔

بعض جگہ اصل اصطلاح فارسی کی لے کر اس سے اپنے شعر کی بنیاد قایم کی ہے۔ مثلاً تر دامن۔ اصطلاح فارسی میں پُر گناہ ہے۔ دیکھو اُسی کی بنیاد پر گیا

مضمون پیدا کیا ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (خواجہ میر درد)

ذوق۔ ع۔ کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے۔

چراغِ سحری۔ بیمار جاں بلب ہے ؎

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے

کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

اور دیکھو اثر دو فارسی دو محاوروں کو کس خوبصورتی سے ترکیب دیا ہے

آشیانے ہیں میر بلبل کے

آتشِ گل سے رات پھول پڑا[1]

پُنبہ دہن۔ یعنی کم گو۔ زبان دراز۔ بے ادب۔ پُرگو۔ استاد مرحوم نے ساقی نامہ میں کہا ہے ؎

شیشۂ مے کی یہ دراز زباں

اس پہ ہے یہ ستم کہ پُنبہ دہاں

شیشے کے مُنہ میں سے عرق یا شربت وغیرہ نکلتے وقت جو دھا بندھتی ہے اُسے اصطلاح فارسی میں زبان شیشہ کہتے ہیں۔

آتش زیر پا۔ بے قرار موئے آتش دیدہ جیسے آگ کی سینک پہنچی ہو ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

---

[1] دلی والوں کا محاورہ ہے۔ اگر رات کو کہیں آگ لگتی تھی تو اصلی لفظوں میں تعبیر کرنا بدشگونی سمجھتے تھے۔ کنایتہً ادا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ دیکھنا کہیں پھول پڑا ہے۔

مُردن چراغ۔ کُشتن چراغ۔ چراغ کے بجھنے اور بجھانے کو کہتے ہیں۔ اُسی سے شمع مُردہ۔ چراغ مردہ۔ دیکھنا ذوق مرحوم نے کس لطف سے جان ڈالی ہے ؎

شمع مردہ کے لئے ہے دمِ عیسیٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

از قصیدہ

داغِ دلِ فسردہ پہ پھاہا نہیں نہ ہو

کام اس چراغِ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

از غزل

کمر کوہ اور دامن کوہ سے بھی دیکھو کیا مضمون نکالا ہے۔ ذوق علیہ الرحمۃ ؎

حاضر ہیں جلو میں ترے وحشی کہ ہزاروں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

گردن مینا۔ آتش نے کیا خوب مضمون نکالا ہے ؎

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈالکر

دستِ سبو۔ خواجہ وزیر نے کس خوبصورتی سے اسکا ترجمہ کیا ہے۔ ؎

ہوں وہ میکش گر نہ آیا میکدہ میں ایکدن
ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے

سوسن دہ زبان۔ فارسی والوں کا خیال ہے۔ میر وزیر علی صبا کہتے ہیں ؎

کھولا بہار نے جو کتب خانۂ چمن
سوسن نے دس ورق کا رسالہ اُٹھالیا

سرو کو آزاد۔ فارسی والوں نے کیا تھا۔ کہ بہار و خزاں۔ اور ثمر و بے ثمری کی قید سے آزاد ہے۔ ذوق مرحوم اس بنیاد پر فرماتے ہیں ؎

بابہ زیر آب جو کی موج میں سب سرو ہیں
کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

قافلہ نکہتِ گل۔ سید انشاء نے کیا خوب ترجمہ کیا ہے ؎

جو ٹھنڈے ٹھنڈے چلی ہے اے آہ
چھاؤں تاروں کی چل نکل تو!
گلوں کی نکہت کا قافلہ بھی
چمن سے ہے لاد پھاند نکلا

آسمان زمین کے قلابے ملانے بھی ایجاد اہلِ اُردو کا ہے۔

ذوق۔ قلابے آسمان و زمیں کے تو نہ ملا
اُس بت سے کوئی ملنے کی ناصح بتا صلاح

طوفان باندھنا۔ بھی انہی کا ایجاد ہے۔ ہندی میں نہ تھا ؎

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا۔

بعض فارسی کے محاورے یا ان کے ترجمے ایسے تھے کہ میر و مرزا وغیرہ استادوں نے لئے۔ مگر متاخرین نے چھوڑ دیئے۔ چنانچہ فارسی کا محاورہ ہے۔

بعض محاورے علما سے تھے پھر متروک ہو گئے۔

تر آمدن۔ یعنی شرمندہ شدن۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

کھلنے میں تر منہ کے کلی پھاڑے گریبان
آگے ترے رخسار کے گل ہو گئے تر آوے۔

توگوئی۔ میر حسن اسکا ترجمہ فرماتے ہیں ع۔

... تو کہ خوشبویوں کے پہاڑ

ایک اور موقع پر کہتے ہیں ؎

کہے تو کہ دریا تھا اک نور کا

میر ؎

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ نہیں تھا

نمود کردن۔ بمعنی ظہور کردن۔ بھی فارسی کا محاورہ تھا ؎

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بلبلا تھا پانی کا

حیف آنہاں یا حیف سانیکہ۔ میر صاحب ؎

حیف وے جن کے وہ اُسوقت ہیں پہنچا لجبو قت
اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

اب اگر کہیں گے تو یہ کہیں گے کہ حیف ہے اُن لوگوں کے حال پر جن کے پاس تو گیا اور وہ بچارے اشارے سے بھی حال نہ کہہ سکے کنے ہندی ہے۔ مگر اب متروک ہے۔

بے ہتی۔ یعنی کم مائیگی۔ میر صاحب کا شعر ہے ؎

اس زمانے کی ترمی سے لہر بحر اچھی نہیں
بے ہتی کرنے لگی دریا دلوں کے حوصلے

خوشم نمی آید۔ مجھے بھلا نہیں لگتا۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ناکامی صد حسرت خوش لگتی ورنہ
اب جی گذر جاتا کچھ کام نہیں رکھتا

خوش بحال کسانیکہ۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

احوال خوش اُنہوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

داغ این حسرت ام - میر صاحب فرماتے ہیں ؎

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

ایکہ یا اے آنکہ - میر صاحب نے کہا ہے ؎

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا

ایک قصیدۂ مدحیہ کے مطلع ثانی میں سودا کہتے ہیں ؎

اے تو کہ کار جن و بشر تجھ سے ہے رواں
تیری وہ ذات جس سے دو عالم ہے کامراں

فارسی میں بیا امر کا صیغہ شعر کے اول میں لاتے ہیں اور وہ مزہ دیتا ہے ؎

بیا کہ گریۂ من آں قدر زمیں نگذاشت
کہ در فراق تو خاکے بسر تواں کردن

عرفی ؎

بیا کہ با دلم آں مے کند پریشانی
کہ غمزۂ تو نہ کردہ است با مسلمانی

میاں رنگیں اسکا ترجمہ کرتے ہیں ؎

آ تجھ بغیر مملکت دل اجاڑ ہے
چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

دستے دریں کار دارد - یعنی وہ اس کام میں واقفیت یا مہارت رکھتا ہے - سودا

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

اودہن ایں کار ندارد۔ سودا نے کہا ہے ؎

نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
سخن تو دیکھ ہے رنگیں ترا چمن مجھ سے

گوش کردن۔ سننا۔ سودا نے ترجمہ کیا ہے۔ ؎

کب اُسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال
یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

بوکردن۔ سونگھنا۔ سودا نے ترجمہ کیا ؎

دیکھوں نہ کبھی گُل کو ترے مُنہ کے میں ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

اور میر صاحب نے اِس سے بڑھ کر کہا ؎

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

خوابم بُرد۔ یا خوابم در ربود۔ یعنی مجھے نیند آگئی۔ جرأت ؎

کل واں سے آتے ہی جو ہمیں خواب لیگیا
دیکھا تو پھر وہیں دلِ بیتاب لے گیا

ہند کا محاورہ نیند آتی ہے۔ خواب کا لے جانا محاورہ نہیں ؎

زنجیر کردن۔ قید کرنا۔ سید انشاء ؎

سودا زدہ ہے دل تو یہ تدبیر کریں گے
اُس زلف گرہ گیر سے زنجیر کرینگے

خاک بر سر کردن۔ سودا نے ترجمہ کردیا ؎

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

ہندی میں سر پر خاک ڈالنی کہتے ہیں۔
اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض رسمیں اور ٹوٹکے جو ایران اور توران میں ہوتے تھے۔ اس کے اشارے اُردو میں کرنے لگے۔ سودا ؎

پروانہ اُن لٹوں کا ہوں قسم ہے روحِ مجنوں کی
نہ مارو مجھ کو چوبِ گل۔ بغیر از بید کی چھڑیاں

تیر اور سودا کے حال میں اِن مطالب کی توضیح ہے۔

داغِ جنوں۔ اُستاد مرحوم عالم طفولیت کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل
زیبائشِ سر کو ہے مرے داغِ جنوں گل

اور میر صاحب مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

سر تا پا آشفتہ دماغی
داغِ جنوں دے جسپہ چراغی

ولایت میں رسم ہے کہ قلعہ کے محاصرہ میں یا ایک لشکر سے دوسرے لشکر میں جب قاصد کا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا تو خط کا پُرزہ تیر میں باندھ کر پھینکتے ہیں۔ چنانچہ تیر اور سودا نے اُسے اُردو میں باندھا ہے

تیر ؎

نامہ جو واں سے آئے ہے سو تیر میں بندھا
کیا دیجئے جواب اجل کے پیام کا

سودا ؎

نہ تھا پیکاں پہ کیا جوہر جو نامہ تیر پر لکھا
اشارہ قتل کا قاتل نے کس تقصیر پر لکھا

اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اصول عامّہ کے بموجب بہت اعتراض ہوئے۔ مگر احتراز نہ ہوئے۔ کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور اصلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر وشکر ہو رہے تھے۔ جتنا اسکا دخل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج دیکھتے ہیں تو اور ہی رنگ ہے۔ ہمارے قادر الکلام انشا پرداز ترجمے کر کے انگریزی کے خیالوں کے چربے اُتارتے ہیں۔ اور ایسا ہی چاہیئے۔ جہاں اچھا پھول دیکھا چُن لیا اور دستار نہیں تو کوٹ میں زیب گریبان کر لیا۔ ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی قادر سخنی کے زور یا ظرافت طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے تو انہوں نے بھی اپنے پیارے مُلک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سودا فرماتے ہیں۔ ع

جیسے کہتا ہے کوئی ہو ترا صفا صفا

سید رضی خاں رضی مرحوم نے کیا خوب کہا ع

تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ اِلی الذی نہ اُلی الذی

دونوں زبان کے تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں۔ اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے اس لئے دیکھو اُن کے خیالات کسقدر ملتے جلتے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے۔ اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ دیتے تھے۔ فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے۔ اس لئے اُردو میں سانپ رہے۔ مگر بھونرے

اُڑ گئے۔ اور اُس کی جگہ مُشک۔ بنفشہ۔ سُنبل۔ ریحان آ گئے جو کبھی یہاں
دیکھے بھی نہیں۔ مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے
اور زلف کو ٹلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام
برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اُس سے کھُلتا رنگ ہوتا تو چنبک برنی کہتے
تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کو بہار دیتے ہیں
مگر چندر مکھ اور ماہ رُخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں ہرن کی آنکھ اور کنول کے پھُول اور ممولا کی
اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم رہے۔ مگر ممولے ہوا
ہوا ہو گئے۔ اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آ گئی جو کسی نے یہاں
دیکھی بھی نہ تھی۔ بلکہ ترک چشم شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

نتار کے لئے بھاشا میں ہتسنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے
اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا۔ فقط کبک دری۔ شور محشر اور فتنۂ
قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔

بھاشا میں ناک کی تشبیہ طوطے کی ناک سے تھی۔ اب زنبق
کی کلی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آتش کا شعر ہے ؎

توڑنے والے گُل زنبق کے ہیں
کاٹنے والے چمن کی ناک کے

فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں مگر سنگر
نے بھی اپنی جگہ مبالغہ میں کچھ کمی نہیں کی۔ چنانچہ آنکھوں کی تعریف میں ایک
شاعر نے کہا گوشے ان کے کانوں سے جا ملے تھے۔
پہلے یہاں ہوا یا ابر یا منش کے کو قاصد کہتے تھے۔ اُنھوں نے

نسیم۔ اور صبا کو قاصد رکھا۔
بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔ استاد مرحوم کا شعر ہے۔ ؎

نالہ ہے اُن سے بیاں درد جدائی کرتا
کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر تم آنسو ہی اپنا روانہ کرو
سودا ؎

قاصدِ اشک آ کے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا مگر کر گیا

فارسی والے طفلِ اشک باندھتے تھے۔ انہوں نے بھی اُسے لڑکا بنایا۔ اور دیکھو استاد مرحوم نے اس کے لئے دامن کیا خوب تیار کیا ہے ؏

طفلِ اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر

اور ظفر نے کہا ؎

کیا ہی شریر لڑکے یہ اوپر تلے کے ہیں

اور معروف نے کہا ہے ؎

ابھی سے نامِ خدا کر لے قاصدی نکلا
یہ طفلِ اشک بڑا پاؤں کا بلی نکلا

یہاں کیا کروں اشک کی ابتری کا یہ لڑکا بد اطوار پیدا ہوا ہے

نہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرف حاکمانہ کرتی رہی۔ نہیں اُسے بھی یہاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی

اور سنسکرت کے اصلیت میں متفق ہیں ان سے قطع نظر کرکے کہتا ہوں کہ
سلاطین چغتائیہ کے دفتروں میں صدہا لفظ ہندی کے تھے جو کہ فارسی
عبارتوں میں بے تکلف مستعمل ہوتے تھے اور اب بھی عہد مذکور کی تاریخوں
میں موجود ہیں۔

مثلاً جھروکہ درشن اور پھول کٹارہ اور کھپوہ مرصع جہانگیر
بادشاہ اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ میرا بھائی شاہ مراد کوہستان فتحپور
سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اُسے پہاڑی راجہ
کہا کرتے تھے۔ اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے
تھے۔ اور اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ "بابا بجہت من باین خواہر خود کہ لاڈلہ
من ست۔ بعد از من باید بروشے سلوک کنی کہ من بادے کنم۔ ناز او برداشتہ
بے ادبی و شوخی ہائے اور ا بگذرانی"۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
شاہجہان بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا
کرتا تھا۔

اسی طرح شعرا نے اپنے تصرفاتِ رنگین کے ساتھ اشعار فارسی
کو رونق دی ہے۔ امیر خسرو چھ سو برس پہلے کہتے ہیں ؎

بنشستہ چوں در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

قران السعدین میں کہتے ہیں ؎

خان کرہ چھوے کشور کشا
کز لب شاہاں کرہ دار دبیا

اور دہلی کی یاد میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے دہلی واے بتانِ سادہ — پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

سرآں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن
ہمہ را بنوکِ مژگاں زدہ بر جگر کٹارہ

عرفی

در چاشت گہ از شبنم گل گرد فشانست
آں باد کہ در ہند اگر آید جگر آید
گشتیم زکچہرِ ایّام
ہوسیم وزر نے دارم

ظہوری۔

سپہر از سرافرازیش در حساب نہ چو کھنڈیش سایہ بر آفتاب

اشرف۔

چو کھنڈی شکوہش اگر سایہ افگند
فیلِ سپہر شانہ بدوزد بزیرِ پا

طغرا۔

شوخ سوسن را بگو دل میر باید قشقہ ات!
ذات راجپوت ست ترسم دست بر جمدھر کند
پاں خوردہ تمن وادہ اگال آں بُتِ ہندی
ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگیں مزہ دارد
شود چہرۂ زرد خورشید آل دہندہش اگر نازنیناں اُگال

اور سہ نشہ میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے "بار جگت گردئی عالم بر خود گرفتہ"

بیان مذکورہ بالا سے تمھیں اجمالاً معلوم ہو گیا کہ اردو کا درخت

فارسی کے استعاروں اور تشبیہوں نے ہماری زبان کا رنگ بدل دیا

اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا۔ مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور اُن کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اسواسطے گویا اُردو بھاشا میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ بھی آیا۔ اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اُسی قدر آتا جتنا کہ چہرے پر آئینہ کا رنگ یا آنکھوں میں سُرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ ہوا کہ بھاشا اور اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ چاہتا ہوں کہ دونوں کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر اُن کے فرق دکھاؤں۔ مگر اس سے پہلے دو تین باتیں خیال میں رکھنی چاہئیں۔ اوّل تو شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔ اس کی طبیعت میں ہمیشہ سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آ گئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی ذکاوت اور لطافت طبعی کے سبب سے اُردو کے خیالات ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ اَن پڑھ یا غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کہ یہ کیا کہا اس لئے اُردو سیکھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگہی رکھتا ہو۔

فارسی اور اُردو کی اِنشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لایق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں اُن خط و خال سے سمجھاتی ہے۔ جو خاص اُسی شے کے دیکھنے۔ سننے۔ سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی۔ مگر سُننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سُننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اُسی کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے۔ بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھ رکھا ہے۔ اسکے لوازمات کو شے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کی نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق کے مُشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حُسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اُسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر۔ وزیر ؎

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو ہو کر
روح میری گلِ عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب دُور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اسقدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔

بلکہ بجائے اسکے کہتے ہیں کہ اگر اسکا ہمائے عقل۔ اوج اقبال سے سایہ ڈالے۔ تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے بلکہ اسکے سینے میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اوّل تو ہُما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے۔ اور وہ بھی اُسی ملک کے ساتھ خاص ہے اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا اور اس پر نقطہ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے۔ وہاں اُن کے فرضی ہُما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اُس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

دوسرے فقرے میں اوّل تو علمائے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے۔ اسپر طبقۂ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں اور روائتیں ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں۔ مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اُس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے۔ اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطفِ زبان کجا۔ اور یہ نہیں تو تاثیر کجا! مزہ وہی ہے کہ آدمی بات کہی آدھی منہ میں ہے اور سننے والا پھڑک اٹھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا۔ اِن خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں۔ اور محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اوّل اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اسکے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں۔ اِن بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملکِ عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی۔ یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

مثلاً رات کو اہلِ صحبت کے جلسے میں اوّل تو ساقی[1] کا آنا واجب ہے۔ پھر معشوق بجائے ایک نازنین عورت کے پریزاد لڑکا ہو۔ اس کی پیشانی اور رخسار سے نور صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اسی لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی چھلکتی ہے۔ اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے کبھی وہی قلقل۔ حق حق ہو کر یادِ الٰہی میں صرف ہوتی ہے مگر پیالہ اپنے کھلے مُنہ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے، مگر عاشق کا تیرِ آہ اسکے سینے کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی۔ کہ عاشق کی صبح مراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع برقع فانوس میں تاج زر سر پر رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشق زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں۔ اور شمع کو عاشق کے غم میں رلاتے ہیں۔ وہ باوفا عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اس کی چربی گھل گھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اسکا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آکر کافور دیتا ہے اور کبھی تباشیر شمع کا دل اس لئے بھی گداز ہے کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن۔ صبح دونوں کے ماتم میں

---

[1] ساقی عربی لفظ ہے اور ایسا ہے جسکے لئے ہندی لفظ ہے ہی نہیں۔ اسکا سبب یہ ہے کہ اس ملک میں ساقی اور دورِ جام کی رسم نہیں تھی۔ اسلئے اسکے خیالات بھی نہیں تھے۔ ۱۲

[2] شمع عربی میں موم ہے۔ پھر موم بتی کو کہنے لگے۔ فارس میں آکر چربی کی بھی بننے لگی۔ مگر نام شمع ہی رہا۔ ہند میں چربی ناپاک ہے۔ اس لئے نہ شمع تھی نہ اسکا نام تھا۔ مرغِ سحر کے ذبح کا مضمون بھی وہیں کا ہے۔ ۱۲

گریبان چاک کرتی ہے۔ عاشقِ بادہ خوار کے لئے مرغِ سحر بڑا موذی ہے اسکے ذبح کو ہمیشہ تیغِ زبان تیز رہتی ہے۔ بادِ سحر قاصدِ خجستہ گام ہے کہ پیغامِ یار کا بہت جلد لاتا ہے اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا سر برہنہ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی فلک کے سبزے گھوڑے پر سوار کرن کا تاجِ زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اُڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتحیاب آیا ہے۔

ان ہی بنیادوں پر جب گلزار کی شگفتگی۔ یا باغ کی بہار دکھانی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے۔ شاہدِ گل کے کان میں قاصدِ صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا کہ وہ مارے ہنسی کے فرشِ سبزہ پر لوٹ گیا۔ طفلِ غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبل شیدا کا دل لبھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے تو گل اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے۔ اسکا چہرہ چمن ہے۔ گل رخسار ہیں سنبل بال ہیں۔ بنفشہ زلف ہے۔ نرگس آنکھیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر بہار موسمِ جوانی ہے۔ درخت جوانانِ چمن ہیں کہ عروسانِ گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں تاک کا نسیہ پڑا اینٹھتا ہے۔ اطفالِ نباتات دایہ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردہ ہزار سالہ میں دم عیسوی کا کام دیتی ہے۔ مگر بلبل زار عشق شاہد گل میں اُداس ہے۔ آبِ رواں عمر گذران ہے۔ اس کی موج کی تلوار سے دل کٹے جاتے ہیں یا سرو کے عکس کا اژدہا لگلے جاتا ہے شبنم کے آنسو جاری ہیں۔ بلبل کبھی خوش ہے کہ گل اسکا پیارا

پا ہنس رہا ہے۔ کبھی افسردہ ہے کہ خزاں کا خونریز ان سب کو قتل کرے گا۔ یا اس کے دشمن گلچیں و صیاد اُسے یہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق ہیں قمری کا گیروا لباس ہے۔ اس کے نالے کا آرہ دلوں کو چیرتا ہے۔ کبھی عاشق زار بھی وہیں آ نکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت و غم سے ہمکنار رہے۔ روتا ہے اور قاصد صبا کو پیغام دیتا ہے کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا۔

بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں اس کے علاوہ بعض خیالات ہیں اکثر ان داستانوں یا قصوں کے اشارے بھی آ گئے ہیں۔ جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً بجائے عورت کے لڑکوں کا عشق۔ ان کے خط کی تعریف۔ شمشاد۔ نرگس۔ سنبل۔ بنفشہ۔ موئے کمر۔ قد سرو وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلیٰ۔ شیریں۔ شمع۔ گل۔ سرو وغیرہ کا حسن۔ مجنوں۔ فرہاد۔ بلبل۔ قمری۔ پروانہ کا عشق۔ فانوس کا بت۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوری۔ رستم و اسفندیار کی بہادری۔ زحل کی نحوست سہیل یمن کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصے۔ زراہ ہفتخوان۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوئے شیر۔ قصر شیریں۔ جیحوں۔ سیحوں وغیرہ وغیرہ۔ ہر چند یہ سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اردو میں بہت سے خیالات انہی کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں

تعجب یہ ہے کہ ان خیالوں نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ ان کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں انہیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا۔ اور سید انشاء کے کلام میں کہیں کہیں ہیں۔ اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف

دیتی ہیں۔

غرضکہ اب ہماری انشا پردازی ایک پرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہیں۔

ہمارے متاخرین کو نئی آفرین لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت. کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اور تنگ و تاریک کیا۔ جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی۔ کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ کلام ان کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے وہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمہ اور عوام کے لئے ایک عجیب گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔ اور جواب انکا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے۔ جو نہ سمجھیں وہ اپنی جہالت کے حوالے۔

اب اس کے مقابلہ میں دیکھو۔ بھاشا کا انشا پرداز برسات میں اپنا باغ کیونکر لگاتا ہے۔ درختوں کے جھُنڈ چھائے ہیں گھن کے بنے ہیں۔ ان کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں۔ آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔ عشق پیچہ گلہ وندہ پر چڑھا جاتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں۔ جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔ میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے مَور میں اسکے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بو جی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں۔ مولسری کے

پھولوں کا مینہ برستا ہے۔ پھل پھلاری کی بوچھار ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا ان کی بو باس میں بسی ہوئی روشوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹھکھیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھوترے کی آواز کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی سماں باندھ رہی ہے۔ پرند درختوں پر بول رہے ہیں اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے گرتی ہے۔ کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہراتا جاتا ہے تو عجب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اترتے ہیں۔ نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں۔ پروں کو پھڑاتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ چرند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک۔ ایک طرف سے کوئلے کی آواز اسی جمگھٹ میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے۔ اور اپنی جدائی کے دکھ کو مزے لے لے کر اٹھاتا ہے۔

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے کبھی کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جدا چنگھاڑتے ہیں پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چنبیلی کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی ہے بست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ شام ہوتے ایک مقام پر پہنچا، دیکھتا ہے کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں۔ ارد گرد سرسبز میدانوں میں سے بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہہ رہا ہے،

جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اسکے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔ اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کے پیڑ بوٹوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دودھیلیں گایوں اور بکریوں کا چارہ ہو جائے۔

جب اُداسی اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدھی رات ادھر۔ آدھی رات اُدھر۔ جنگل سنسان۔ اندھیر بیابان۔ مرگھٹ میں دور دور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد لال لال دیدے پھاڑے لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپریوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا ناگ ککڑی کی طرح کھڑا چبا رہا ہے۔ پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے۔ کہ لیجیو لیجیو۔ مارلیو۔ مارلیو۔ جانے نہ پائے۔ دم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہوتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سنسان ہے۔ پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا۔ پانی کا شور۔ اُلو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتوں کا رونا۔ یہ ایسی دہشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔

دیکھو یہ دونوں باغ آمنے سامنے لگے ہیں۔ تم نے مقابلہ کیا؟ دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے؟ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور جن خوش آوازوں کو سنتا ہے۔ یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا

انشا پرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں۔ اور دہانِ غار پتھروں کے دانت پیسنے لگیں اِن مضامین کو دیکھ کر اوّل ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے۔ کہ ہر ملک کی انشا پردازی اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال کی تصویر بلکہ رسم و رواج اور لوگوں کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اسکا یہ ہے کہ جو کچھ شاعر یا انشا پرداز کے پیشِ نظر ہوتا ہے وہی اس کی تشبیہوں۔ استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران۔ خراسان اور توران کی زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں ذوق و شوق پیدا کرتا ہے۔ وہاں بہار میں بلبل ہزار داستان ہے۔ یہاں کوئل اور پپیہا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اس کی کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں جہانگیر نے اپنی توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات بہار ہی فصلِ بہار ہے۔ اور کوئل یہاں کی بلبل ہے۔ اس موسم میں عجب لطف سے بولتی ہے اور اور مستیاں کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے تو بسنت رُت کا سماں ہے جس میں ہولی کے رنگ اڑاتے ہیں پچکاریاں چھٹتی ہیں۔ گلال کے قمقمے چلتے ہیں۔ وہ باتیں نہیں جو فارسی والے بہار کے سے بیان کرتے ہیں۔

بہرحال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت کا۔۔۔ کی سے ادا ہوتی۔ وہ فارسی کی اضافت میں آکر مختصر ہو گئی۔ اس کے علاوہ استعارہ و تشبیہ۔ جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے کہ وہ کتاب یا انشا پردازی کی زبان نہ تھی۔ یا اس سبب سے کہ برابر کا اور کے آنے سے کلام بدمزہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح بہت تشبیہ میں بھی لفظوں کے بڑھاوے سے کلام عبارت فصاحت

ہندی کی انشا پردازی بھی مبالغہ سے پاک نہیں

فارسی انشا پردازی کی کمی کا شکریہ

سے گر جاتا تھا۔ اب انہوں نے فارسی کو اس میں داخل کر کے استعارہ و تشبیہ سے مرصع کر دیا جس سے وہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی اور زور بر کلام۔ اور تیزی و طراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی۔ اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی۔

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا۔ کہ انہوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا۔ مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر۔ اور اظہار اصلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بیں لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پرواہو گئے۔ انجام اسکا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا۔ اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنج رقعہ اور مینا بازار یا فسانۂ عجائب لکھ سکتے ہیں لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب نہیں بیان کر سکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ نذکو کیونکر ہوا۔ اور کیونکر اختتام کو پہنچا۔ اور اس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے کہ روئداد وقت کی اور صورت حال معاملے کی ایسی ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی۔ اور یہ تو نا ممکن ہے کہ ایک فلسفہ یا حکمت اخلاق کا خیال لکھیں جسکی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے اور اس کے دلائل جو حسن بیان کے پردے میں برابر جلوہ دیتے جاتے جاتے ہیں۔ وہ دلوں سے تصدیق کے اقرار لیتے جائیں۔ اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر ہونا منظور ہو۔ اس میں پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکیں۔

یہ قباحت فقط نازک خیالی نے پیدا کی کہ استعارہ و تشبیہ کے انداز، اور

استعاروں اور تشبیہوں کی کثرت نے اداے مطالب اور اظہار اصلیت کی طاقت کھو دی

مترادف فقرے، تکیہ کلام کی طرح ہماری زبانِ قلم پر چڑھ گئے۔ بیشک ہمارے متقدمین اس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھولے مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا ان کے مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں نہیں! ہماری اصلی انشا پردازی اس رستہ میں قاصر ہے۔

انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھیے تو اسے اسطرح ادا کیجئے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سما دل پر چھا دیوے۔

بیشک ہماری طرزِ بیان اپنی چستی بندش اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے۔ اپنے رنگین الفاظ اور نازک مضمونوں سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اسکے مبالغۂ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین آسمان کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں۔ چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر رواں ہیں۔ مگر حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں۔ مثلاً ہم اگر کسی کے حسن کی تعریف کرتے ہیں تو رشکِ حور اور غیرتِ پری پر قناعت نہ کر کے اُسے ایک پتلا ناممکنات اور محالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حسنِ خداداد اور خود ایک عالم ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گذر جاتی ہے۔ دل ہی جانتے ہیں۔ پس اسی کو اسطرح کیوں نہیں ادا کر دیتے کہ سننے والے بھی کلیجہ پکڑ کر رہ جائیں۔

ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے تو رستم۔ تہمتن۔ اسفندیار۔ روئین تن شیر بیشۂ وغا۔ نہنگِ قلزم ہیجا وغیرہ وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اُس کی بلند

گردن۔ پھرے ہوئے ڈنڈ۔ چوڑا سینہ۔ بازوؤں کی گولاوٹ۔ پتلی کمر۔ غرض خوش نما بدن اور موزوں ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے۔ اس کی اپنی دلاوری۔ اور ذاتی بہادری بھی آخر کچھ نہ کچھ ہے۔ جس کے کارناموں نے اسے اپنے عہد میں امتیاز کر رکھا ہے۔ اسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں ادا کر دیتے جسے سن کر مردار خیالوں میں اکثر ٹکڑا اور کملائے ہوئے دلوں میں اُمنگ پیدا ہو جائے۔

ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے دل پر داغ دینگے۔ کبھی اُسے فردوس بریں اور جنات روئے زمین بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتے کی تعریف میں رنگ رنگ سے ورق سیاہ کر دیں گے۔ مگر اس کی ہریالی کا لہلہانا۔ بلبلوں کا چہچہانا۔ میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آبِ رواں کا لہرانا۔ موزوں درختوں، گلزار کے تختوں کی بہار۔ ہوا کی مہک اور طوطی کی چہک۔ پپیہے کی کوک، کوئل کی ہوک جو روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پر اثر کرتی ہے اسکا بیان اسطرح نہیں کرتے جس کے پڑھنے سے آنکھوں میں سما چھا جائے۔ میدانِ جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اڑا کر آسمان میں تلپٹ کر دیتے ہیں۔ اور خون کے دریا ملکوں سے ملکوں میں بہا دیتے ہیں۔ مگر اپنے موقع پر وہ تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی ہمدردی اور رفیق پر جان نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہو۔ وہ نہیں۔

دوسرے کوچے میں آکر علم کی تعریف پر اُترتے ہیں۔ تو اس کی برکت سے پیر پیغمبر۔ ملائک۔ فرشتے بنا دیتے ہیں۔ کاش اس کے عوض میں چند ظاہر کھلے کھلے فائدے بیان کر دیں جس سے ہر شخص کے دل میں اسکا شوق پیدا ہو اور عالم جاہل سمجھ جائے کہ اگر بے علم رہونگا تو خواری اور ذلت کی زندگی سے دین و دنیا دونوں خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اس

توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی یعنی جو لطف ان کا انگریزی زبان میں ہے وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ اہل زبان کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے۔

اگر شائستہ قوموں کی انشا پردازی سوال کرے کہ اُردو کی انشا کیوں اس حالت میں مبتلا رہی؟ تو حاضر جوابی فوراً بول اُٹھے گی۔ کہ قوم کی انشا پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیتِ ملکی کے ہوتے ہیں جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی۔ اور بادشاہوں اور امیروں کی قدر دانی تھی ویسی ہی انشا پردازی رہی اور خاتمہ کلام اس فقرے پر ہوگا کہ کوئی پرندا اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اس کے بارو فارسی۔ سنسکرت بھاشا وغیرہ تھے پھر اُردو بچاری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پر کیوں کر جا بیٹھتی۔ مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے جسقدر شے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم سے دستور ہے کہ سلطنت کے اندرونی اور بیرونی زور قوم کے ذاتی اور علمی لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے اور سلطنت کے کل انتظام اور اُسکے سب قسم کے کاروبار انہی کے شمول اور انہی کی عرق ریز تدبیروں سے قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی تجویزوں کی بنیاد علمی اور عقلی اور تاریخی تجربہ کے زوروں پر قایم ہوئی تھی۔ پھر لیاقتِ مذکورہ

بھی سینکڑوں ہی میں منحصر نہیں بلکہ ہزاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جہاں اور مہمات سلطنت ہیں وہاں ایک یہ بھی تھا کہ ہر امر تنقیح طلب جلسۂ عام کے اتفاق رائے سے تحریروں اور تقریروں میں فیصل ہوتا تھا۔ موقع پر جب ایک شخص جلسۂ عام میں استادہ ہوکر کوئی مطلب ادا کرتا تھا تو ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی تھی۔ پھر جب طرف ثانی اسکے مقابل میں جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا تھا۔ اور اب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے دوسری رائے پر پھیر لیتے ہیں خیال کرنا چاہیئے کہ ان کے بیان میں کیسی طاقت اور زبان میں کیا کیا زور ہوں گے۔ برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں کی زبان میں اگر ہوئے تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعرا کے دیوان ہوئے جو فقط تفریح طبع اور دل لگی کا سامان ہے۔ کجا زمین کجا آسمان نہ وہ جوہر پیدا ہوا۔ نہ کسی نے اس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ باوجود اسکے اردو کی خوش اقبالی۔ اور خوش رواجی قابل رشک ہے۔ کیونکہ اسکی اصل تو برج بھاشا جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں یعنی دین کی زبان تھی۔ خود اردو دلی سے نکلی جسکا چراغ دلی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہیئے تھا۔ پھر بھی اگر بیچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہوکر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے۔ تو جواب یہی سنیں گے کہ اردو اس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو تو اول افغانی ہے۔ اٹک اترے تو پوٹھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ جہلم تک داہنے پر کشمیر پکار رہا ہے کہ یورولا، یورولا۔ یعنی ادھر آؤ۔ بائیں پر ملتان کہتا ہے کہ کتھے گھنیاں۔ یعنی کہاں چلے۔ آگے بڑھے تو وہ بولی ہے کہ پنجابی خاص اسی کو کہتے ہیں۔ اسکے بائیں پر پہاڑی ایسی زبان ہے۔ کہ

دلی زبان اردو کے لیے کیوں ٹکسال ہے

کہ تحریر تقریر سب سے الگ ہے۔ ستلج اتریں تو پنجابیت کی کمی سے لوگوں کی وضع و لباس
میں بھی فرق شروع ہوتا ہے۔ دلی پہنچے تو اور ہی سما بندھا ہوا ہے۔ میرٹھ سے بڑھے
تو علیگڈھ میں بھاشا سے ملا جلا پورب کا انداز شروع ہو گیا۔ کانپور۔ لکھنؤ سے الہ آباد
تک یہی عالم ہے۔ جنوب کو ہٹیں تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔ پھر ادھر آئے
تو بنگالہ ہے۔ اور کلکتہ پہنچکر تو عالم گوناگوں خلق خدا۔ اور ملک خدا ہے جسکا انتہا تو حد
اندازہ سے باہر ہے۔ میرے دوستو تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن قبح کے
واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکہ کے لئے ٹکسال۔ کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان
کے لئے دلی ٹکسال تھی، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دار الخلافہ تھی۔ دربار ہی میں خاندانی
امراء اور امیر زادے خود صاحب علم ہوتے تھے۔ اُن کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی
تھیں۔ جن کی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت ظرافت کا قالب
ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو۔ لباس۔ ادب، آداب نشست برخاست بلکہ بات بات
ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی۔ کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے
لئے ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے۔
اور چونکہ دار الخلافہ میں شہر بشہر کا آدمی موجود تھا اس لئے وہ دلپذیر ایجاد اور اصلاحیں
ہر شہر میں جلد ہی عام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے تک دلی ہر بات کے لئے سند ہی
اور انہی صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دلپسند
ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں
شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے اور دلپذیر باتوں کے سامان
موجود ہوں گے۔ وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ میری دلی کے لوگ

اور اُن کی اولاد تھی۔ کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہنچے
تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہوگیا اور
اس کے ضمن میں زبان بھی دلّی کی اطاعت سے آزاد ہوگئی۔ اس آزادی کی ناسخ
آتش۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ اہلِ کمال نے بنیاد ڈالی۔ اور انیس۔ دبیر۔ رند۔ خواجہ وزیر
اور سرور نے خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے زبان کو بڑی ترقی دی۔ مگر اکثر ان میں ایسے
ہوئے کہ جنگل کے صاف کرنے کو اُٹھے تھے مگر اس میں دریا کا دہانہ لا ڈالا یعنی
صفائی زبان کی جگہ لغات کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی
زمانہ نے اُلٹ دیا۔ اب آفتاب ہماری بلکہ آفاق کا نشان ہے جسے حکم نہیں
کہ ان کی قلمرو کے خط سے باہر حرکت کر سکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب
سے پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ دلی برباد
لکھنؤ ویران۔ دونوں کے سندی اشخاص کچھ ہیوند زمین ہوگئے۔ کچھ دربدر خاک بسر
اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ جیسے جھاوینوں کے بازار ویسے ہی دلّی بلکہ اس سے
بھی بدتر۔ کوئی شہر ایسا نہیں رہا جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔
کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص جن سے کہ وہ شہر قابلِ سند ہو صرف
گنتی کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ زمانے کی صدھا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں
ان میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڈھا جیسے خزاں کا پتہ کسی درخت پر باقی ہو
اس بڈھے کی آواز کمیٹیوں کے غُل اور اخباروں کے نقار خانوں میں سنائی
بھی نہیں دیتی۔ پس اگر دلّی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کی زبان
کیونکر سندی ہو سکتی ہے۔ ہوا کا رُخ اور دریا کا بہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے

نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھیریگا اِس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اب زبان کیا رنگ بدلے گی ہم بھی جہاز بے ناخدا میں توکل بخدا کر بیٹھے ہیں۔ زمانہ کے انقلابوں کو رنگِ چمن کی تبدیلیاں سمجھ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے آج تک
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہیں دیکھتے

نظمِ اُردو کی تاریخ

فلاسفہ یونان کہتے ہیں۔ شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور و ظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے۔ دیگِ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے۔ دریائے سیماب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اڑاتا آتا ہے۔ صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے۔ یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئے۔ وہ کہتا ہے سنہری گیند ہوا میں اُچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آئی ہے۔ کبھی مرغانِ سحر کا غل اور عالمِ نور کا جلوہ۔ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ بادشاہ مشرق سبز خنگِ فلک پر سوار۔ تاج مرصع سر پر رکھے۔ کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے .... تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے جامِ فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی

تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے۔ اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی۔ غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ مگر اصلیت سے انہیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اسکے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنائع الہٰی سے ہے۔ اُسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اوّل ایک مضمون کو ایک منظر میں لکھتے ہیں، اور نثر میں پڑھتے ہیں پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں۔

(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے۔

(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی قسم کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے۔ اور قوتِ بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے۔ جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔ اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خداداد ہو۔ قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے مگر حقیقت میں اسکا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں جو چیز اُس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے۔ اور اس سے کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے۔ وہ ہر شخص کو نصیب نہیں، خواہ لطف و شگفتگی ہو خواہ

آزردگی یا بیزاری۔ یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اٹھاتا ہے اسکے لئے ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کسطرح انہیں ترکیب دوں تاکہ جو کیفیت اسکے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے۔ اور وہ بات کہوں کہ دل پر اثر کر جائے۔

شاعر کبھی ایک حجرے میں تنہا بیٹھتا ہے۔ کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں تنہا نظر آتا ہے۔ اور اسی میں خوش ہوتا ہے۔ وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ دفتر و دربار اور ملک داری کے سب کارخانے اور سامان موجود ہیں اسکے پاس کچھ نہیں مگر الفاظ اور معانی سے وہی سامان بلکہ اس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے دکھا دیتا ہے۔ بادشاہ سالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک فتح یا خزانہ جمع کرتا ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے گھر بیٹھے دے دیتا ہے۔ اور خود پروا نہیں۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح کر کے وہ خوشی نہیں حاصل ہوتی جو اُسے ایک ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے کہ اپنی جگہ پر موزوں سجا ہوا ہو اور حق یہ ہے کہ اُسے ملک کی پروا بھی نہیں۔

اس باب میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ جس مکان میں بیٹھتے تھے، تنگ و تاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبراتے۔ اور کہتے کہ یہ مکان بدلو۔ گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں۔ تم کیونکر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہوں ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے کبھی مسکراتے۔ کبھی جو غزل کہتے ہوتے اُسے دیکھنے لگتے۔ کبھی ان کا مُنہ دیکھتے۔

خدا نے مکانات۔ باغ۔ آرام و آسائش کے سب سامان دئے تھے۔ مگر وہ وہیں بیٹھے رہے اور ایسے بیٹھے کہ مر کر اُٹھے! اچھا ان کے قصائد اور غزلیں دیکھ لو کسی بادشاہ کی سلطنت میں اس شان و شکوہ اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں؟ گویا سلطنت کے سامان سب انہی کا مال تھے کہ جس طرح چاہتے تھے اپنے کام میں لاتے تھے جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے تھے تو بادشاہ کو جو مالکِ سلطنت ہوتا ہے کچھ اُن سے زیادہ خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اُسے ان کا فکر بھی رہتا ہے۔ انہیں پروا بھی نہیں ہوتی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی اسی طرح کوئی زبان اپنے اہلِ زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے سلسلے میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہلِ زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے۔ پھر باتیں کرنی سیکھے۔ ہاں نظم جوشِ طبع تھا اسلئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعتِ اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدر تی روئیدگی نے بھی زور کیا لیکن وہ صدھا سال تک دوہروں سے رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے۔

امیر خسرو کی ایجاد و اختراع

امیر خسروؔ کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی۔ ملکِ سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا۔ **خالق باری**۔ جسکا اختصار آجتک بچوں کا وظیفہ ہے۔ کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اس میں فارسی کی بحروں نے اوّل اثر کیا۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے۔ جو اب متروک ہیں۔ اسکے علاوہ، بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکُرنی۔ انمِل۔ دو سخنے وغیرہ خاص اُن کے آئینہ کا جوہر ہے۔ ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں۔ کیونکہ اُن سے بھی اسوقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتہ لگتا ہے:۔

پہیلیاں

نبولی کی پہیلی:۔

تروَر سے اِک تریا اُتری اُسنے بہت رجھایا
باپ کا اسکے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پیا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

آئینہ کی پہیلی:۔

فارسی بولی آئینہ
ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے
منہ دیکھو جو اُسے بتائے

ناخون کی پہیلی:۔

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی ہوت انگارا گنگے سے بھڑ جائے

گیت عورتوں کے لئے

بانس کا منڈوا کا باشا۔ باشے کا وہ کھاجا — منگ ملے تو سر پر رکھیں واہ گورا او راجا
سی سی کر کے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک — اُلٹا سیدھا پھر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال — عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑواتی ہیں۔ درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں۔ مل مل کر جھولتی ہیں اور گیت گا گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ان میں شاید کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو:-

جو پیا آون کہہ گئے۔ اجہوں نہ آئے سوامی ہو۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے۔
آون آون کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ ماس۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ وغیرہ

یہ گیت بھی انہی امیر خسرو کا ہے اور ہر ورا راگ میں لئے بھی انہی کی رکھی ہوئی ہیں۔ واہ کیا زبانیں تھیں کہ جو کچھ ان سے نکل گیا الہام کو بھایا۔ گویا زمانے کے دل پر نقش ہو گیا۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گائے آج ہوئے کل بھول گئے۔ چھ سو برس گزرے۔ یہ آج تک ہیں۔ اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دئے جاتے ہیں۔ اس حسن قبول کو خداداد نہ کہئے تو کیا کہئے۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو یہ گیت تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پیا اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا مناسب نہ تھا لیکن اُمنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ انہیں بھی فصل کی بہار مناتی تھی۔ اُن کے لئے اور گیت رکھے تھے۔ چنانچہ ایک لڑکی گویا سسرال میں ہے۔ برسات کی رُت آئی وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں گاتی ہے:-

اماں میرے باوا کو بھیجو جی۔ کہ ساون آیا۔ — یعنی مجھے آکر لے جائے

بیٹی ترا باوا تو بڈھاری۔ کہ ساون آیا۔ یعنی وہ کیونکر آسکتا ہے
اماں میرے بھائی کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا۔ یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیوں کر آئے
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا یعنی اسکے لئے تو وہ دونوں عذر نہیں
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا بھلا وہ میری کب سنے گا۔

ذرا غور کر کے دیکھو۔ باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کیطرف جھکتے تھے تو ایسے تہہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ اور خیالات پر نظر کرو کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔

مکرنیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔

مکرنی۔ اسگری رین موہے سنگ جاگا بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اسکے بچھڑے پھاٹت ہیا اے سکھی ساجن یا سکھی دیا
مکرنی ۲۔ سرب سلونا سب گن نیکا وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون اے سکھی ساجن نا سکھی لون
" ۳۔ وہ آوے تب شادی ہووے اُس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی کنوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ اُن میں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اُس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو کھسرو یہی ہے۔ اُنہوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے جسکے سب گیت گاتے ہیں۔ اور

پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں۔ انمل سنتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر ایک ان میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہدے۔ دوسری نے چرخے کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول۔ چوتھی نے کتے کا۔ انہوں نے کہا کہ مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے پہلے پانی تو پلا دو۔ وہ بولیں جب تک ہماری بات نہ کہدیگا نہ پلائیں گے۔ انہوں نے جھٹ کہا:۔

انمل۔ کھیر پکائی جتن سے۔ چرخہ دیا جلا۔ آیا کتا کھا گیا۔ تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا۔

اسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کی ایجاد ہے۔

ڈھکوسلا۔ بھادوں پکی پیپلی۔ چو چو پڑی کپاس۔ بی مہترانی دال پکاؤ گی یا تنگا ہی سو رہوں

دوسخنے۔ گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا۔ گلا نہ تھا۔

جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا۔ تلا نہ تھا۔

انار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا۔ دانا نہ تھا۔

دوسخنے فارسی۔ سوداگر را چہ می باید۔ بوچے کو کیا چاہیئے۔ دوکان

اردو تشنہ را چہ می باید۔ ملاپ کو کیا چاہیئے۔ چاہ

شکار رچہ می باید کرد۔ قوت مغز کو کیا چاہیئے۔ بادام

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے بڑی بجتی تھی۔ اس لئے دھرپت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان میں سے اکثر گیت ان کے آجتک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلے نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہی نے نکالا ہے۔

لطیفہ۔ سلطان جی صاحب کے ہاں ایک سیاح فقیر مہمان آئے۔ رات کو دستر خوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی

ختم ہی نہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب مہمان کی دلشکنی سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے مگر بول نہ سکتے تھے کہ آدھی رات کی نوبت بجی۔ اُسوقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا سمجھ میں تو ایسا آتا ہے

"نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو۔ خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدستِ توکردم خانہ گرو۔ خانہ برو۔ خانہ برو"۔

حرف حرف کی حرکت وسکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کر رہے ہیں اور نہ کہ بدستِ توکردم خانہ گرو کو دیکھو۔ اس نے کیا کام کیا۔

نقل۔ ایک دن کسی کوچے میں سے گزر ہوا۔ دُھنیا ایک دُکان میں رُوئی دُھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دُھنیے کو دیکھو ایک ہی انداز پر رُوئی دُھنکتا ہے۔ سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں؟ کوئی بولا کہ قدرتی اُستاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا لفظوں میں کیونکر لاسکیں؟ فرمایا:۔

"درپئے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، رفت رفت جاں ہم رفت۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آنہم رفت، آنہم رفت۔ اینہم آنہم اینہم، آنہم۔ آنہم رفت۔ رفتن۔ رفتن۔ رفتن دہ۔ دہ۔ دہ۔ رفتن دہ۔ رف رف۔ رفتن دہ۔ دفتن دہ"۔

نقل۔ محلہ کے سِرے پر ایک بُڑھیا ساقن کی دوکان تھی چمو[۵۱] اسکا نام تھا شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے تو وہ بھی سلام کرتی کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی۔ یہ بھی اسکی دلشکنی کا خیال کرکے دو گھونٹ لے لیا

[۵۱] بکسر اوّل۔ واو مجہول

کرتے۔ ایک دن اُس لئے کہا کہ بلالوں ہزاروں غزلیں گیت راگ راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو کوئی
چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ انہوں نے کہا۔ بی چھمّو بہت اچھا کئی دن کے بعد اُسنے پھر کہا۔ کہ
بھٹیاری کے لڑکے کے لئے خالق باری لکھدی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھدو گے تو کیا ہوگا۔
آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہجائیگا۔ اسکے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آگیا۔ کہا۔ لو بی چھمّو سنو

اوروں کی چوپہری باجے چھمّو کی اٹھ پہری۔ — یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں۔
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری — جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں
صاف صوف کر آگے راکھے جسمیں ناہیں توسل — پیالہ بھنگ صاف مصفّٰی حاضر کرتی ہے جسمیں تُس تنکا نہ ہو
اوروں کے جہاں سینک سمائے چھمّو کے واں موسل — بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے

کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سینک کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ خیر ان کی بدولت چھمّو کا بھی نام رہ گیا۔

حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً شاہنامہ کو ٩ سو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ٧ سو برس سمجھو۔ گلستاں۔ بوستاں کو ٦ سو برس کہو۔ زلیخا کی عمر قریب ٣ سو برس کے ہوئی۔ مگر ابتک سب جوان ہیں۔ اردو میں باغ و بہار۔ بدر منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانہ عجائب جاں بلب ہو گیا۔ بہت کتابیں اول شہرت پاتی ہیں پھر گمنام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے۔ بہتیری تصنیف ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض کتابوں کی عمریں میعاد معلوم پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں تب تک چھپتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں جب تعلیم سے خارج ہوگئیں مر گئیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ع قبول خاطر و لطف سخن خداداد است۔ خدا یہ نعمت نصیب کرے۔

غرض اسی جوشِ طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد اور ہوا جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں:-

(۱) مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلۂ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل کہتے ہیں وہی قافئے یا ردیف اور قافئے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اول مطلع۔ یا کئی مطلعے۔ پھر چند شعر۔ اخیر میں مقطع اور اسمیں تخلص

(۲) عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔

(۳) فارسی اور بھاشا کو لون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ زبان پر چٹخارہ دیتی ہے

اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے کہ انہوں نے بنیادِ عشق کی عورت ہی کی طرف سے قایم کی تھی جو کہ خاصہ نظم ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس عشق کا انقلاب کس وقت ہوا غزل مذکور یہ ہے۔

زحال مسکیں مکن تغافل۔ درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں۔ نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا۔ نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمانہ تبدیلیوں کا اصلاح دینے والا ہے پھر تراشیں دیکر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر اسوقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اس طرز کا رواج جاری ہو جاتا۔ البتہ ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت کے علاوہ دوہرے اور گیت بھی لکھے اور وہ ایسے اعلیٰ رتبے کے ہیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب کی تصنیف میں نہایت مدد گرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ فارسی کی بحروں میں کوئی شعر اسکا نہیں۔ دکن میں ایک سعدی گزرے ہیں انکا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے۔ اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرہ میں اُن کے اشعار مندرجہ ذیل کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے ؎

قشقہ چو دیدم بر رخت گفتم کہ یہ کا ریت ہے　　گفتا کہ دُر ہو باورے۔ اس شہر کی یہ ریت ہے
همنا تمہیں کو دل دیا تم دل لیا اور دُکھ دیا　　ہم یہ کیا تم وہ کیا۔ ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی کہ گفتہ ریختہ۔ در ریختہ در ریختہ　　شیر و شکر ہم ریختہ۔ ہم ریختہ ہم گیت ہے

کبیر اور تلسی داس وغیرہ کے دوہرے عالم میں زبان زد ہیں۔ مگر وہ فقط اتنی سند کے لئے کارآمد ہیں کہ اس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندوؤں کی زبانوں پر بھی ہو گیا تھا۔ نہیں اس نظم سے علاقہ نہیں جو فارسی سے آکر اردو کے لباس میں ظاہر ہوئی اور ملکی مالک کو بیدخل کر کے گوشہ میں بٹھا دیا۔ حامد کوئی شخص ہوئے ہیں۔ انکا زمانہ معلوم نہیں کہتے ہیں کہ حامد باری اُنہی کی تصنیف ہے۔ ان کی فقط سات شعر کی ایک غزل دیکھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی پنجابی بزرگ ہیں۔ اس میں سے مطلع پر قناعت کرتا ہوں ؎

عزم سفر جوں کردی ساجن نینوں نیند نہ آئی جی　　قدر وصالت نادانستم تم بن برہ ستائی جی

اگر یہی شعر ہیں تو جب سے ابتک بیشمار شاعر پنجاب میں نکل آئیں گے یہاں کی شاعری

اب تک انہی بیتوں میں جاری ہے۔ لیکن یہ شاعر اور اُن کی شاعری وہ نہیں ہے جس سے ہم بحث کرتے ہیں آحمد گجراتی ہم عہد و ہموطن ولی کے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

گر بیضۂ زاغے کسے در زیر سیمرغے نہد — از اصل خود ناید بروں آخر گلیلا ہوئے پر

گر طفلکے بازی گرے خواننده و عالم شود — اصلیکہ دارد کے رود آخر زنبورا ہوئے پر

گر بچۂ شیرے کسے باشیر رو بہ پرورد — مردی کہ دارد کے رود آخر بگیلا ہوئے پر

سیوا۔ ایک مصنف دکن میں گذرا ہے جس نے روضۃ الشہدا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مرثیے اسکے اب تک وہاں کے امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور غالب ہے کہ اس طرح کے شاعران عہدوں میں بہت ہوں گے۔ مگر ایسی شاعری کو علمی شاعری نہیں کہہ سکتے۔

نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں لکھا۔ اس عہد میں نظم اُردو کے ضعف کا یہی سبب ہو گا کہ جو ذی استعداد اُردو کے اہل زبان ہوتے تھے وہ اُردو کی شاعری کو فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہتا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام الناس موزوں طبع۔ دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے۔ جو اہل ولایت شاعر ہوتے تھے وہ فارسی شعر کہتے تھے۔ اُردو انہیں آتی نہ تھی۔ کہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمسخر کرتے ہیں۔ چنانچہ مرزا معز موسوی خاں فطرت کہ زبدۂ شعرائے ایران اور عمدۂ شعرائے عالمگیری سے تھے۔ اور بعد اُن کے قزلباش خاں امید کے متفرق اشعار دیکھے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اُسوقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی اُسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ میر معز فرماتے ہیں ع

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم پری ہے ۔ در خانۂ آئینہ گتا جوم پری ہے

عزلباش خاں اُمید باوجودیکہ فارسی میں بڑے نامور ہیں اور اہل ہند کے ساتھ ان کے جلسوں کی گرمجوشیاں بھی مشہور ہیں۔ مگر اردو میں جو اظہارِ کمال کیا ہے وہ یہ ہے ؎

بامن کہ بہتی آج مری آنکھ ہوں پری ۔ غصہ کیا و گالی دیا اور دِگر لڑی

اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ نظم موجودہ نے دکن سے ظہور کیا چنانچہ میر تقی میرؔ نے بھی ایک غزل میں شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے ۔ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قایمؔ ان کے ہم عصر نے صاف کہہ دیا ہے ؎

قایمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ۔ اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

بہرحال عالمگیر کے عہد میں ولیؔ نے اس نظم کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا۔ اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب[۱] ہو کر اوج پر آیا۔

نظم اردو کے آغاز میں یہ امر قابلِ اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذومعنیین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے۔ مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنیاد اسی پر رکھی گئی۔ اور دورِ اول کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بھی نمونے کے طور پر لکھتا ہوں ؎

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوشخط کی زلف ۔ ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ اسلام کے

کیوں نہ ہم سے ہو وہ سجن باغی ۔ قد ہو جس کا نہال کی مانند

[۱] آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا۔ وہ بڑا مشتاق شاعر تھا جسکے چار دیوان اردو میں موجود ہیں۔

تو جو دریا کے پار جاتا ہے — دل مرا وار وار جاتا ہے
تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا — یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کر[1] ہے
نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا
نہ لیوے لیکے دل وہ جعد مشکیں — اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

شاہ حاتم نے بڑی کوشش کر کے ان رنگ آمیزیوں سے اُردو کو پاک کیا چنانچہ ان کے حال میں معلوم ہوگا۔

سودا کے عہد میں بھی مادۂ فاسدہ کا بقیہ چلا آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایک قصیدہ میں ان بزرگوں کی شکایت کی ہے جس کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

مو نہ ہو پرورش شانہ تو پھر ہے موسل — رامپور کی ہو کٹاری تو کہیں سیتا پھل

مگر لطف یہ ہے کہ خود بھی موقع پاتے تھے تو کہیں نہ کہیں کہہ جاتے تھے چنانچہ فرمایا ہے ؎

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں — فیروزہ ہوئے مُردہ تو دیتا ہے وہ جِلا

اگرچہ وہ انداز پہلے کی نسبت بالکل نہیں رہے۔ پھر بھی جس قدر ہیں وہ ایسے زبان پر چڑھے ہوئے ہیں کہ جن مضامین کے ادا کرنے کی ہمیں آجکل ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی بھولنی نہ چاہیئے کہ جس طرح ایک نوجوان مرغ اپنے پہلے پر جھاڑ کر نئے پر نکالتا جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان بھی اپنے الفاظ کو بدلتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لفظ ہیں جن کا دور بدور شعرا کے کلام میں اشارہ کیا گیا ہے۔

[1] کر ہندی میں محصول کو اور سنسکرت میں ہاتھ کو کر کہتے ہیں۔ سر کے بالوں کی جڑوں میں جو خشکی ہو جاتی ہے اُسے بھی کر کہتے ہیں۔

یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے یعنی مضامین عاشقانہ میخواری۔ مستانہ۔ بے گل و گلزار۔ وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا۔ ہجر کی مصیبت کا رونا۔ وصل موہوم پر خوش ہونا۔ دنیا سے بیزاری۔ اسی میں فلک کی جفاکاری۔ اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں نتیجہ جسکا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میرے دوستو! دیکھتا ہوں کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ اور ہر قوم اپنے اپنے فنِ انشا کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے۔ کیا نظر نہیں آتا ہماری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پا انداز میں پڑی ہے۔

ہمارے بزرگوں میں دلی میں اوّل مرزا رفیع سودا۔ پھر شیخ ابراہیم ذوق۔ نے زبان کی پاکیزگی۔ الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی۔ دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا۔ غالب نے بعض موقع پر ان کی عمدہ پیروی کی۔ مگر معنی آفرینی کے عاشق تھے۔ اور زیادہ توجہ ان کی فارسی پر رہی۔ اس لئے اُردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلی۔ جرأت نے عاشق و معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ۔ اور خواجہ حیدر علی آتش۔ رند۔ صبا۔ وزیر وغیرہ نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی مخلوطہ بنانا بنانے سے حاصل کیا؟ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے۔ گویا ایک ٹوٹا قلم ہے

جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔ دارالخلافہ دہلی جو کہ انشا اور شاعری اُردو کے لئے دارالضرب تھا۔ وہاں ذوقؔ و غالبؔ نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں ناسخؔ و آتشؔ سے شروع ہو کر رند و وزیرؔ۔ صبا تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانے میں مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحبِ کمال بھی ایسے ہوئے کہ اصلوں کو رونق دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحبِ کمال کا پیدا ہونا نہایت درجہ کی آسودگی اور زمانے کی قدردانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے۔ اور اب زمانے کا رنگ اس کے برخلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعرا کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہونا چاہیئے۔ البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہلِ کمال ہوں

خاتمۂ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوستِ زوال میں آگیا ہے۔ کبھی اوجِ اقبال پر بھی طلوع کرے گا یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکامِ وقت کی یہ زبان نہیں نہ ان کے کار آمد ہے۔ اسی لئے وہ انکے قدردان نہیں۔ نہ وہ اسے جانتے ہیں نہ اسے جاننے کو کچھ فخر جانتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے شعرا کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اچھا۔ یا قسمت! یا نصیب۔ جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تو یہ عزت ہوئی اب اس نیم جان مُردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے جن کی دردناک

آوازیں کبھی کبھی آہ سرد کے سُروں میں بلند ہو کر سینوں میں رہجاتی ہیں۔ وہ کبھی دل آسودہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قایم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کر لیں۔ مگر پیٹ کو کیا کریں؟ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا۔

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے جس سے اس کے بھی دن پھریں۔ اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے؟ جواب ملا کہ ہاں۔ ہمت اور تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہیئے کہ اسے حاکموں کے کارآمد یا ان کی پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔ اور جسقدر فائدہ ہوگا اُسی قدر ذہن اور فکر جودت کریں گے۔ اور دلچسپ ایجاد اور خوشنما اختراع نکالیں گے۔ اسی کو ترقی کہتے ہیں۔

یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ اُردو میں جو سرمایہ انشا پردازی کا ہے فارسی کی بدولت ہے۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اُردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون اسقدر

مستعمل ہو گئے کہ سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں۔ وہی مقرری باتیں ہیں۔ کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں۔ کہیں اُدل بَدل کرتے ہیں۔ اور کہے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ انہیں کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزہ رہا۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے! اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ و معانی اور اِستعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں۔ اور وہ اِسقدر زبانوں پر رواں ہو گئے ہیں کہ شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اگر اور خیال نظم کرنا چاہے تو ویسا سامان نہیں پاتا۔ البتہ ذی اِستعداد مشّاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں لیکن کمبخت حسن و عشق کے مضمون۔ اس کے خط و خال۔ اور بہار گلزار کے الفاظ۔ ان کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اوّل اُسے بُھلائیں۔ پھر اُسکے مناسب مقام ویسے ہی نرالے استعارے نئی تشبیہیں۔ انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں۔ اور یہ بڑی عرق ریزی اور جانکاہی کا کام ہے۔ بے ہمتی جو ہماری قوم پر حاکم بااختیار بنی ہوئی ہے۔ اُسے اِس سے زیادہ روکنے کا موقع کیا مل سکتا ہے۔

اس اتفاقی معاملے نے اور تو جو کچھ کیا۔ بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ اربابِ زمانہ نے متفق الفظ کہہ دیا کہ اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے

اِس سے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں۔ اور یہ ایک بڑا داغ ہے۔ جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے۔ اور کیونکر دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے۔ جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔ اور اس داغ کو نہ فقط دھوئے گی۔ بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔ فقط

دیوان غالب
طاہر ایڈیشن عکسی

یوں تو بازار میں ایک آنے سے لیکر اکیس روپے تک کا دیوان غالب ملتا ہے مگر حضرت غالب کے شیدائی جو کچھ ڈھونڈنا چاہتے ہیں وہ چیز نہیں ملتی اور آنکھیں ترستی رہجاتی ہیں حسنِ اتفاق سے ہمارے ہاں حضرت غالب کے دیوان کا قلمی نسخہ موجود تھا اس کی صحت کے لئے حضرت غالب کے دستخط سند ہیں احباب کے بیحد اصرار سے ہم نے وہ صحیح ترین نسخہ بذریعہ فوٹو بلاک پاکٹ ایڈیشن چھپوایا ہے۔ مجلد مطلا۔ دیدہ زیب کاغذ اسقدر نفیس اور مضبوط کہ سو سال خراب نہ ہو۔ خود منگائیے۔ احباب کو تحفہ دیجئے

قیمت دو روپے آٹھ آنے

پتہ:- آزاد بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی

ALLAMA IQBAL LIBRARY
24323

قیمت عہ

سرورق گیلانی پریس لاہور

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN